شاہکار

No. 59

چند لکھنے والے

• احمد ندیم قاسمی • ن م راشد • رام لعل • احتشام حسین
• محافظ حیدر • کرشن موہن • اقبال متین
• مصطفٰے زیدی • رفعت نواز • ناصر زیدی • نایاب نسرین
• شمس الرحمٰن فاروقی • پریم وار برٹنی
• شہریار • صغیر احمد صوفی • ندا فاضلی • کمار پاشی • زہرا نگاہ
• علیم اللہ حالی • وقار خلیل • شمیم حنفی • مشتاق قمر
اور دوسرے

قیمت 1.25

اُردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار

مجلس مشاورت

سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمن اعظمی
مظفر شاہجہاں پوری
جیلانی بانو

مُدیر —
محمود احمد ہنر

معاون —
انتخاب سید

قیمت
۱/۲۵

۵۹

سالانہ
بارہ روپے

دفتر شاہکار، ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد-۳

لکھنؤ آفس- سروری منزل۔ کچا احاطہ، لکھنؤ

بمبئی آفس- ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸- فون نمبر ۲۷۷۹۶۵

ترتیب

اپنی بات ——— محمود احمد ہنر

افسانے

۱۔ احمد ندیم قاسمی	آسیب	"نقوش" لاہور	۵
۲۔ محافظ حیدر	ایک سالگرہ	"گفتگو" بمبئی	۲۲
۳۔ رام لعل	آخری خواہش	"سیپ" کراچی	۴۴
۴۔ اقبال متین	کٹا ہوا نام	"کتاب" لکھنؤ	۶۳
۵۔ رفعت نواز	وہ بات	"اوراق" لاہور	۷۱
۶۔ نایاب نسرین	تنہا تنہا	"سیپ" کراچی	۷۹

نظمیں

۷۔ ن۔م۔ راشد	پیرو	"اوراق" لاہور	۱۰۳
۔ فارغ بخاری	خزاؤں کی بہار	"سیپ" کراچی	۱۰۴
۔ کرشن موہن	تیرا خیال۔ تجدید	" "	۱۰۴
۔ صغیر احمد صوفی	چاندی کا خدا	"شاعر" بمبئی	۱۰۵
۱۔ سید فضل المتین	حرفِ اوّل و آخر	"صبا" حیدرآباد	۱۰۶
۱۲۔ شہریار	ایک نظم	"سیپ" کراچی	۱۰۶
۱۳۔ ندا فاضلی	فضا خاموش ہے	"اوراق" لاہور	۱۰۷
۱۔ وقار خلیل	دو مختصر نظمیں	"تحریک" دہلی	۱۰۷
۱۔ انتخاب سید	تجزیہ	"سیپ" کراچی	۱۰۸
۱۶۔ کمار پاشی	شکست رویّے کی مثال	"صبا" حیدرآباد	۱۰۹

۱۷- پریم وار برٹنی ـــــ انا اور اندیشہ ـــــ "آندھرا پردیش" حیدرآباد ـــ ۱۰۹

۱۸- رؤف خلش ـــــ نئی رتوں کا سفر ـــــ "کتاب" لکھنؤ ـــ ۱۱۰

۱۹- علیم اللہ حالی ـــــ قطرہ کا مقدر ـــــ " " ـــ ۱۱۰

۲۰- رحمان فراز ـــــ تلاش ـــــ "اوراق" لاہور ـــ ۱۱۱

۲۱- حیدر عمر شاداں ـــــ آل ـــــ "تحریک" دہلی ـــ ۱۱۱

مضمون

۲۲- علامہ درد نکودری ـــــ نیائے شرما اور اُن کی شاعری ـ گریۂ شبنم ـــ ۱۱۳

۲۳- نیائے شرما ـــــ دو غزلیں ـــــ " ـــ ۱۲۴

غزلیں

۲۴- احمد ندیم قاسمی ـ "فنون" لاہور ـ ۱۲۶

۲۵- سید احتشام حسین ـ "فنون" لاہور ـ ۱۲۷

۲۶- شہیرا فضل جعفری ـ " " ۱۲۷

۲۷- مصطفےٰ زیدی ـ " " ۱۲۸

۲۸- شمس الرحمٰن فاروقی ـ " " ۱۲۸

۲۹- حامد جیلانی ـ "اردو زبان" سرگودھا ۱۲۹

۳۰- ناصر زیدی ـ "ادب لطیف" لاہور ـ ۱۲۹

۳۱- مخمور سعیدی ـ "کتاب" لکھنؤ ـ ۱۳۰

۳۲- حباب ہاشمی ـ "کتاب" لکھنؤ ـ ۱۳۰

۳۳- شمیم حنفی ـ "گفتگو" بمبئی ـ ۱۳۱

۳۴- افضل احسن ـ "اوراق" لاہور ـ ۱۳۱

۳۵- عبدالصمد تپش ـ "شاعر" بمبئی ـ ۱۳۲

۳۶- زہرا نگاہ "فنون" لاہور ـ ۱۳۲

انشائیہ

۳۷- مشتاق قمر ـــــ آئس کریم کھانا ـــــ "اوراق" لاہور ـــ ۱۳۴

فیملی پلاننگ

۳۸- ڈاکٹر ذاکر حسین ـــــ خاندانی منصوبہ بندی ـــــ محکمہ اطلاعات حکومت ہند ـ ۱۴۱

اپنی بات

حالیہ درمیانی مدت کے انتخاب کے بعد یو۔پی میں کانگریس پھر برسرِ اقتدار آگئی۔ موجودہ وزیرِ اعلیٰ شری چندر بھان گپتا، جو چرن سنگھ کے دورِ حکومت میں حزبِ مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے اردو کی حمایت کر چکے تھے، اب پھر فرما رہے ہیں کہ اردو ریاست کی دوسری زبان نہیں بنائی جاسکتی۔

اردو کے سلسلے میں آزادی کے بعد سے یو۔پی میں کانگریس حکومت کا جو رویہ رہا ہے اسے محض ہٹ دھرمی کہا جاسکتا ہے یا پھر اردو کو ختم کرنے کی ایک ناپاک سازش۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ پندرہ بیس سال میں یہ کہا جاسکے کہ یو۔پی میں اردو جاننے والا ہی کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ جب اردو کی تعلیم ہی ختم کردی جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا۔

ہمارے خیال میں اب اردو کو بچانے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے، اپنے بچوں کے لئے اردو کی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ پوری ریاست میں ایک تحریک چلائی جائے اور لوگوں کو بتلایا جائے کہ اگر انھوں نے اردو زبان کو زندہ نہ رکھا تو ان کی تہذیب اور ثقافت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ تحریک بڑے پیمانے پر چلائی جائے اور سیاسی اختلاف کے باوجود ہر اردو دوست اس میں سرگرمی سے حصہ لے۔

گذشتہ نمبر میں ہم نے پنڈت نیائے شرما کا نام سرپرست کی حیثیت سے شایع کیا تھا۔ افسوس کہ ۳ر فروری سنہ ۶۹ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے متعلق ہم اپنے تاثرات دوسرے صفحات پر شایع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا انھیں صبر دے اور شرما جی کی آتما کو سکون و شانتی عطا فرمائے۔

محمود احمد ہنر



نیاے شرما

احمد ندیم قاسمی

آسیب

کمرہ بھی وہی تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی وہی تھی لیکن بڑ کا وہ درخت کٹ چکا تھا جو سید امجد حسین
کا دوست اور بزرگ تھا۔ یوں تو وہ درخت اس وسیع و عریض بنگلے کے ہر حصے میں موجود تھا۔
مگر اس کمرے کی کھڑکی کے ساتھ اس کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ ان دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر بڑ کا درخت
نہ ہوتا تو یہ کھڑکی کیسے ہوتی! ——— اور اب وہ درخت نہیں تھا مگر کھڑکی اسی طرح موجود تھی۔
اور اس کے چہرے پر فق ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہوا کا بہت تیز جھونکا بھی بڑ کی
ٹہنیوں اور پتوں میں سے گزر کر جب اس کھڑکی تک آتا تھا تو ایک سرگوشی سی بن جاتا تھا
یا صرف اتنا ہوتا تھا کہ دوسری منزل کی چھت تک پہنچی ہوئی بیل کے دل نما پتے رخ
بدل کر اس کمرے میں شریر بچوں کی طرح جھانکتے تھے اور ہٹ جاتے تھے۔ مگر اب وہ باقاعدہ
اندر گھسے چلے آ رہے تھے اور دیر تک ایک جگہ رک کر یوں لرزتے تھے جیسے انھوں نے
ہنسی پر ضبط کر رکھا ہے اور وہ اندر ہی اندر گٹک رہے ہیں۔ مگر کھڑکی تھی کہ اپنا غار کا سا
منہ کھولے، بے حس کھڑی تھی۔ اسے تو بڑ کے کٹ جانے کے بعد سید امجد حسین کے
دل و دماغ کی طرح ایک تڑاقے کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانا چاہئے تھا۔

رات جب اس نے کھڑکی بند کر دی تھی تو چاند شیشوں کے پار اتنا اداس ہو رہا تھا
کہ نیلا پڑ گیا تھا۔ صبح جب اس نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ چڑیوں کا ایک غول اوپر سے
اتر کر آتا تھا اور بڑ کی پناہ گاہ نہ پا کر پھر اوپر اٹھ جاتا تھا اور شور مچاتا تھا جیسے چڑیاں

ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں کہ یہ کیا سانحہ گزر گیا۔ یہ چڑیاں سالہا سال سے ہر صبح اس بڑ پر بیٹھ کر دن بھر کی مشقت کے منصوبے بناتی تھیں۔ مگر وہ بڑ نہیں تھا تو جیسے ان کے پنجوں کے نیچے سے پورا کرۂ ارض نکل گیا تھا۔

وہ کھڑکی میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کھڑکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ وہ اسے چنوادے گا۔ وہ اس گھر کی ساری کھڑکیاں چنوادے گا۔ وہ اس گھر کے دروازے اور دریچے اور روشندان سب چنوادے گا۔ سید امجد حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے کٹا ہوا پیڑ اس کے اندر اگنے لگا ہے اور اس کی شاخیں اس کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی پھیل رہی ہیں۔ اس نے کھڑکی کو تڑ سے بند کر دیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ پھر بیل کھڑکی کے شیشوں میں سر پٹخنے لگی اور کھڑکی ہی میں سے سورج کی ایک کرن گزری اور تلوار کی طرح کمرے کو چیرتی ہوئی سامنے کی دیوار میں گڑ گئی۔ بڑ موجود ہوتا تو باہر کی کسی بھی چیز کی مجال تھی کہ وہ اس کی تنہائی کے سکون کو متلاطم کرتی؟ بڑ نے اس کی ساری شخصیت کو اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ اس پر بڑ کا سایہ تھا۔ بڑ اس کا آسمان تھا۔ ان دنوں وہ سوچتا تھا کہ اگر کبھی بڑ کٹ گیا تو اس کے ساتھ ہی پورا بنگلہ ڈھے جائے گا اور وہ اس میں دب کر مر جائے گا۔ اب بڑ کٹ چکا تھا مگر بنگلہ بھی موجود تھا۔ وہ کمرہ بھی اپنی کھڑکی سمیت موجود تھا۔ حد یہ کہ وہ خود بھی موجود تھا۔

— کیا میں موجود ہوں؟ سید امجد حسین نے آئینے کے سامنے جا کر سوچا۔

تب اس کے خد و خال پگھلنے لگے اور اس کے کندھوں پر ایک اور چہرہ نمودار ہوا اور اس چہرے نے کہا۔ "چھوڑیئے بھی ابا جی۔ اس بڑ کی بڑی خوبی یہی ہے نا کہ یہ بوڑھا ہے۔ اگر بڑھاپے کے سوا اس کی کوئی اور خوبی بھی ہے تو خدارا مجھے بتائیے۔ اس صورت میں مجھے اجازت دیجئے کہ —"

نہیں!" وہ چیخ اٹھا اور آئینے نے اس کا چہرہ اسے واپس دے دیا۔ وہ کتنا

بھیانک ہو رہا تھا! اس نے اپنی اتنی خوفناک بدبختی کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ دیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔

اور اس روز سید امجد حسین بالکل بے خیالی میں قطعی غیر ارادی طور پر دن بھر روتا رہا اور اسی کمرے میں پڑا اسی کھڑکی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ مر جانا چاہیئے یا مار ڈالنا چاہیئے؟

اس نے کتنے چاؤ سے اپنے بیٹے کا نام سید سقراط شاہ رکھا تھا اور اسے ایم اے تک فلسفہ پڑھایا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک روز یہی سقراط ایک پیالے میں زہر گھول کے لایا اور بولا "دیکھئے ابا جی۔ آپ بہت بوڑھے ہیں۔ آپ اس محل جیسے بنگلے میں بھلے نہیں لگتے۔ آپ جب لان میں آرام کرسی بچھا کر اس پر لیٹ جاتے ہیں اور ٹانگیں سامنے تپائی پر رکھ لیتے ہیں اور اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو جاتے ہیں تو سنہری دھوپ اداس ہو جاتی ہے اور سبز باڑ کے پتوں کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور ملازم یوں دبے پاؤں گزرتے ہیں جیسے لان میں ایک میت پڑی ہے۔ میرے خیال میں یہ بالکل غلط بات ہے اس لئے پدرانہ شفقت سے کام لیجئے اور زہر کا یہ پیالہ پی کر مر جائیے۔ آپ نے مجھے پڑھایا، لکھایا، مہذب بنایا، اب یہ آخری احسان بھی کر ڈالیئے!"

قریب قریب یہی ہوا تھا۔ جب سقراط کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک روز جب امجد حسین لان میں آرام کرسی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا تو سقراط آیا اور اس کے سامنے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ منتظر رہا کہ سقراط گفتگو شروع کرے گا، مگر جب وہ کچھ نہ بولا تو اس نے پوچھا "کیوں بیٹا، کیا اخبار پڑھنا ہے۔؟"

"جی نہیں" سقراط نے کہا "ایک عرض کرنا ہے۔"

وہ سقراط کی خلاف معمول سنجیدگی سے چونکا اور اخبار کو ایک طرف رکھ کر بولا "کیا بات ہے؟"

"پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے۔" سقراط نے اپنی عمر سے پندرہ سال کم کے لہجے میں کہا۔

سقراط کی اس سعادت مندی نے اسے سرشار کر دیا وہ بولا "نہیں بیٹا، تم سے خفا ہونے کے بعد اس دنیا میں میرا صرف یہ کام رہ جائے گا کہ خودکشی کر لوں اور میں فی الحال خودکشی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں اس بڑ کی طرح دنیا پر چھا جاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی" سقراط اتنی واضح یقین دہانی کے باوجود مذبذب تھا۔

"تو کہو۔"

"وہ جی بات یہ ہے ___" سقراط یہ کہہ کر رک گیا اور کچھ یوں پہلو بدلا جیسے اپنے انتشار کو سمیٹ رہا ہے۔ "بات یہ ہے کہ یہ جو ہمارے بنگلے میں بڑ کا درخت ہے نا ___" وہ پھر رک گیا۔

"ہاں ہاں!" سید امجد حسین کو کچھ تشویش ہوئی۔

"اسے کٹوا دیجئے۔" سقراط نے یہ تین الفاظ تیزی کے ساتھ اتنے وقفے میں ادا کیے جتنے وقفے میں ایک لفظ بولا جاتا ہے۔

اور وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ مشینی آدمی ہے اور اسے اٹھانے والا بٹن دبا دیا گیا ہے۔

سقراط بھی اٹھ کھڑا ہوا اور مسلسل بولتا چلا گیا۔ "اس نے ہمارے سارے بنگلے کو ڈھانپ رکھا ہے سڑک پر سے گزرنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کسی کا بنگلہ ہے۔ سارے بنگلے کے اتنے لمبے برآمدے کی صرف ایک محراب نظر آتی ہے جیسے یہ کسی سائیس کا کوارٹر ہو کار پورچ میں آتی ہے تو جیسے کسی غار میں گھس گئی ہے۔ دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ دنیا جوہری دور میں سے گزر رہی ہے اور تمہارا خاندان ابھی تک درخت پر سے نہیں اترا آخر اس بڑ میں آپ کو کیا حسن نظر آتا ہے کہ ایک روز مالی نے میرے کہنے سے میری کھڑکی کے

سامنے پھیلی ہوئی شاخ کے چند پتے توڑ کر پھینک دیئے تو آپ نے اسے پیٹا بھی اور نوکری سے بھی جواب دے دیا۔ ایسے بھونڈے درخت تو صرف جنگلوں ہی میں بھلے لگتے ہوں گے۔ آبادیوں میں تو پھول لگائے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایسے درخت جن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہو کہ وہ خوبصورت ہوں اور ہر وقت جوان نظر آئیں۔ اب اس مصیبت کو کٹوایئے اور جو اتنا بڑا میدان اس کی گرفت سے آزاد ہو، وہاں کیاریاں بنوایئے اور پھول لگوایئے۔ میں ملک بھر کی نرسریوں سے یورپ اور امریکہ کے ایسے ایسے پھول جمع کرلاؤں گا کہ آپ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ ہفتے بھر بعد یہاں ولیمہ ہو گا مگر آپ کو ضد ہے کہ وہ بھی اس منحوس بڑ کے نیچے ہو گا جس کے ایک ایک پتے سے سو سو حشرات لٹک رہے ہیں ——"

سقراط سانس لینے کے لئے رکا تو امجد حسین بولا۔ کہہ چکے؟"

سقراط نے کہا۔ "جی ہاں سمجھ لیجئے۔ مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔"

"—— تو سنو" وہ بولا۔ "بڑ کا یہ درخت اس وقت تک نہیں کٹے گا جب تک اس کے سائے میں رکھی ہوئی میری میت اٹھ نہیں جاتی۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔"

سقراط اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکتا رہ گیا اور باپ کہتا رہا۔ "تم جانتے ہو۔ میں تمہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ اس درخت نے ہمارے خاندان کی چار پشتیں دیکھی ہیں۔ اس کی عمر پنجاب پر انگریز کے اقتدار سے بھی زیادہ ہے۔ میرے دادا نے جب ۱۸۸۰ء میں یہ بنگلہ بنوایا تو اس وقت کے بڑے بوڑھوں کے مطابق اس بڑ کی عمر آدھی صدی سے بھی کچھ زیادہ رہی تھی۔ اس وقت یہ ہماری طرح جوان تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ دادا کہتے تھے، اگر یہ بڑ نہ ہوتا تو یہ بنگلہ کبھی نہ بنتا یا کم سے کم یہاں نہ بنتا۔ اس وقت یہاں چار طرف ویرانہ تھا مگر دادا نے آس پاس کے ویرانے کو گلزار میں بدل دیا اور یہ بڑ اس گلزار کا بادشاہ تھا۔ دادا نے اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر کو اسی بڑ کے نیچے ٹی پارٹی

دی تھی اور اس کی ایک شاخ میں ریشم کے رسوں کا جھولا ڈالا گیا تھا جس میں میمیں جھولی تھیں خود لیڈی صاحبہ بھی جھولی تھیں اور کہا تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس بڑ کو اکھڑ کر ولایت لے جائیں اور وہاں اپنے بنگلے کے لان میں لگائیں ۔"

باپ بیٹا دیر تک ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے اور باپ اسے بڑ کے بارے میں وہ ساری باتیں بتا رہا جو وہ اسے بچپن سے بتا رہا تھا۔ مگر آج ان باتوں میں بعض نئے انکشافات بھی شامل تھے ۔ "اگر تیز ہوا میں بڑ کا کوئی پتہ اڑتا ہوا سڑک پر چلا جائے تو میں اس کا پیچھا کر کے اسے پکڑ لاتا ہوں۔ میں اس کے گرے ہوئے پتوں کو جلا دیتا ہوں مگر کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی ان پر پاؤں رکھے، یہ بڑ تو سقراط بیٹے، میرے لئے ایک صحیفہ ہے اور اس کے پتے اس صحیفے کے ورق ہیں۔ اس بڑ کے نیچے تمہارے دادا نے اپنا بچپن گزارا، انگریز گورنس نہیں انھیں بچہ گاڑی میں گھماتی تھی۔ ابا جی مجھے خود بتاتے تھے کہ جب اماں سے ان کے رشتے کی بات ہو رہی تھی اور میرے نانا جان اس رشتے کے حق میں نہیں تھے، تو بڑ کے نیچے وہ جہاں سنگ مرمر کی بنچیں بچھی ہیں نا، وہیں انھوں نے اماں کا وہ خط کھولا تھا جس میں انھوں نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ رشتہ طے نہ ہوا تو وہ زہر کھا لیں گی۔ پھر ۱۹۳۸ء میں میری شادی پر جو دلیمہ ہوا، وہ بھی اسی بڑ کے نیچے ہوا تھا اور اس میں خود گورنر صاحب شامل ہوئے تھے اور انھوں نے بڑ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ درخت نہیں ہے، یہ تو قلعہ ہے۔ اس روز سے میں نے اسے سچ مچ کے قلعے کی صورت دینا شروع کر دی۔ جہاں جہاں سے اس کی داڑھی لٹکی وہیں بیلیں لگوا دیں، جو داڑھی کے گرد لپٹتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ اب دور سے ایسا لگتا ہے جیسے اس قلعے کی چھت سبز رنگ کے اتنے بہت سے ستونوں پر کھڑی ہے۔ تم اسی قلعے میں پروان چڑھے ہو۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر اب تک تم پر اسی کا سایہ رہا ہے، اس بڑ کا ایک ایک پتہ، ایک ایک ریشہ تمھیں اپنا دوست، اپنا والی سمجھتا ہے اور تم اسے کٹوانے پر تلے ہوئے ہو۔ تم اپنے کٹوا کر اپنے بنگلے کی نمائش کرنا چاہتے ہو مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح تمہارا قلعہ ٹوٹ جائے گا۔ تمھارا بنگلہ ننگا ہو

ہو جائے گا۔ بارش اسے چاٹنے لگے گی۔ دھوپ اسے چوسنے لگے گی۔ آج کل کے موسم بہت بے رحم ہوتے ہیں بیٹا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ بھی جڑ سے کٹ جائے گا۔ میں سوچتا ہوں تمھیں یہ خیال آیا ہی کیوں؟ کس چیز نے تمھیں ایسا سوچنے پر آمادہ کیا؟"

پھر سید امجد حسین اپنے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑ کے سائے کے غار میں اتر گیا۔ اوپر شاخوں میں قسم قسم کے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ نیچے اس قطعے کے سبز ستونوں پر ادوسے پھول کھل رہے تھے جو گھنے سائے کی وجہ سے کالے کالے لگتے تھے۔ تنے کے پاس پہنچ کر اس نے سقراط سے کہا "دیکھو بیٹا! اس ایک تنے میں کتنے بہت سے تنے گتھے ہوتے ہیں۔ اور پھر کیا یہاں ایسا نہیں لگتا جیسے آسمان نیچے اتر آیا ہے اور ہماری اور ہمارے بنگلے کی ڈھال بنا کھڑا ہے لگتا ہے نا؟"

"جی" سقراط اس دوران پہلی بار بولا "ایسا ہی لگتا ہے۔ جیسے آسمان نیچے اتر آیا ہے۔"

سقراط کی شادی کے دوسرے ہی روز بعد دعوت ولیمہ ہوئی تو سید امجد حسین نے بڑ کو سچ مچ کا آسمان بنا دیا۔ بڑ کی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ناقابل یقین حد تک لمبی شاخوں کا کوئی ایک انچ بھی ایسا نہ تھا۔ جہاں قمقموں کی صورت میں ستارے نہ جگمگا رہے ہوں۔ مہمان عش عش کر اٹھے البتہ ایک حادثہ ہو گیا۔ جب دعوت جاری تھی تو سب ستارے ایک دم بجھ گئے اور آسمان جیسے اور بھی نیچے اتر کر گونجنے لگا عورتیں چیخ اٹھیں اور بھگدڑ مچی تو پلیٹوں اور گلاسوں کے ٹوٹنے کی آوازوں نے دہشت میں اضافہ کر دیا۔ فوراً ہی خدام گیس کے بے شمار ہنڈے اٹھائے ہوئے آئے جن کا انتظام ایسے ہی امکان کے پیش نظر پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ یہی لوگ یہ خبر لائے کہ باہر آندھی آئی ہے۔

"لیجیے، باہر آندھی آئی ہے اور بڑ کے نیچے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔" سید امجد حسین نے ہنس کر بڑے فخر سے کہا۔

کسی نے اس کی ہنسی کے جواب میں تائیدی ہنسی کا تکلف نہ برتا کیونکہ سب سقراط کا اعلان سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ "خواتین وحضرات! اب جب کہ گیسوں کی روشنی ہو رہی ہے مجھے ایک ضروری اعلان کرنا ہے۔ بجلی بجھی تو ایک خاتون اپنے شوہر کے دھوکے میں مجھ سے لپٹ گئیں۔ پھر جب میں نے اپنا تعارف کرایا اور فریاد کی کہ مجھ سے الگ ہو جائیے کہ اگر میری نئی نویلی دلہن نے دیکھ لیا تو عمر بھر کے لئے مجھ سے کٹی کر لیں گی تو وہ صاحبہ الگ ہوئیں۔ مگر میں ان سے معافی مانگنا بھول گیا۔ چنانچہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جو خاتون مجھ سے لپٹی تھیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں! نشانی ان خاتون کی یہ تھی کہ خوشبو لگا رکھی تھی، بالوں میں پنیں تھیں اور ساڑی ریشمی تھی!"

سب خواتین چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں مگر سب نے خوشبو لگا رکھی تھی، سب کے بالوں میں پنیں تھیں اور سب کی ساڑیاں ریشمی تھیں۔ پھر وہ سب جھینپ کر ایک ساتھ ہنسیں اور اس وقت تو قہقہوں کا ایک طوفان سا امڈ پڑا جب ایک معمر خاتون پرلی طرف سے گھبرائی ہوئی آئیں اور سید امجد حسین کے پاس آ کر بولیں "ہائے سید۔ تمھارے اس جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟"

پھر کوئی تین چار روز بعد جب سید امجد حسین لان میں کرسی بچھائے، تپائی پر پاؤں رکھے، اخبار پڑھ رہا تھا تو سقراط اور نگینہ آئے اور اس کے پاس مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

"کہو بیٹی، کیسی ہو؟" اس نے نگینہ سے پوچھا اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شادی کے فوراً بعد لڑکی کے خد و خال میں کتنی دھاریں اور نوکیں ایک دم نکل آتی ہیں۔

"ــــ ایک عرض ہے انکل۔" نگینہ نے کنکھیوں سے سقراط کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"اس روز جب میں نے اس بنگلے میں پہلا قدم رکھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے منھ مانگا تحفہ دیں گے۔"

"ہاں ہاں کہا تھا۔ یقیناً کہا تھا۔" خوشی سے سید امجد حسین آرام کرسی کے بالکل آخری سرے تک کھسک گیا۔ پھر بہت آگے جھک کر بولا۔ "تم کچھ مانگو تو سہی۔ سقراط کہہ رہا تھا کہ امریکہ کا چھ مہینے کا ٹرپ ٹھیک رہے گا مگر تمھاری مرضی مقدم ہے چلو بولو۔"

"تو پھر عرض یہ ہے۔" نگینہ بولی "کہ ــــ مگر آپ سچ مچ دیں گے نا انکل؟"

سید امجد حسین بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ "ارے لڑکی تو کہہ تو سہی۔"

اور نگینہ بولی "تو پھر بڑ کا یہ درخت کٹوا دیجیے۔ یہ تو مجھے بالکل زہر لگتا ہے۔"

وہ جیسے بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بہت پھیل گئیں اور گردن بہت آگے نکل آئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے سقراط کی طرف دیکھا۔ مگر سقراط اٹھا تو ساتھ ہی نگینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں لان سے نکل کر برآمدے کی طرف دکھائی دینے والی واحد محراب کے رستے اندر چلے گئے۔

"اکبر!" سید امجد حسین اس زور سے بولا کہ بڑ پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر رہ گئے یہ آواز قتل ہونے والے کی چیخ کے مشابہ تھی۔

کچھ دیر کے بعد سقراط اور نگینہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ اکبر نے کار کی ڈگی میں دو سوٹ کیس رکھے ہیں۔ پھر امجد حسین اوپر کے کمرے سے اتر کر آیا اور جیسے بڑ میں سے نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی تو سقراط لپک کر آیا اور کار کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے بولا "آپ تو ابا جی کہیں جا رہے ہیں؟" ڈرائیور نے کار روک لی۔ اتنے میں نگینہ بھی آ گئی۔

امجد حسین نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر اعلان کیا۔ "میں اپنی فرم کی سب شاخوں کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ سال دو سال میں آ جاؤں گا۔"

"سال دو سال میں؟" سقراط اور نگینہ حیران رہ گئے۔

"دیکھئے انکل" نگینہ نے جھک کر کہا "اگر آپ ایک دم سال دو سال کے لئے کہیں جا رہے ہوں
تو اپنا وعدہ پورا کرتے جائیے اور میرا تحفہ مجھے ـــــ"
مگر ادھر سے سقراط نے اسے بازو سے بھینچ لیا ادھر کار چل دی اور پھر نگینہ کو ایک
دم ہنسی چھوٹ گئی۔
"ارے بس ناگی" سقراط بولا "ابھی ابھی تم نے ناشتہ کیا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد اتنا بہت
سا ہنسنے سے انتڑیوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں ـــ ابا جی کہتے ہیں"
آخری الفاظ پر نگینہ پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا اور تیز ہوا کے جھونکے سے لان میں پڑی
ہوئی تپائی پر سے اخبار ورق ورق ہو کر ادھر ادھر اڑ گیا۔

چھ سات مہینوں کے بعد جب سید امجد حسین کی کار اس کے بنگلے کے صدر دروازے
میں داخل ہوئی تو وہ پچھلی سیٹ پر جیسے اچھل پڑا "ٹھہرو دلاور۔ کہاں جا رہے ہو؟
یہ ہمارا بنگلہ کہاں ہے"
"یہی ہے صاحب" ڈرائیور نے کار روک لی اور پلٹ کر سید امجد حسین کو ایک طبیب
کی سی تشویش سے دیکھا۔
پھر ادھر سے اکبر بھاگتا ہوا آیا۔ دوسرے ملازم بھی اپنے کوارٹروں سے نکلے مگر وہیں
ایک قطار سی بنا کر رک گئے۔ وہ سب یوں دم بخود کھڑے تھے جیسے ابھی تھوڑی دیر میں
کوئی بم پھٹنے والا ہے۔ سید امجد حسین نے اکبر کو دیکھا تو کار سے نکلا اور دروازے کو اس
زور سے بند کیا کہ پوری کار لرز کر رہ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے اکبر کے سلام کا بھی جواب
نہ دیا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔ "سقراط!"
سقراط ٹائی باندھتا ہوا برآمدے میں نمودار ہوا مگر ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ
امجد حسین اسی شدت سے چلایا "نگی کہاں ہے؟"

" آ گئے ابا جی" سقراط برآمدے سے نکلا۔

"میں پوچھتا ہوں میرا بٹوہ کہاں ہے؟" امجد حسین رونے کی حد تک چیخا۔

سقراط نے پلٹ کر دیکھا نگینہ بھی برآمدے میں آگئی تھی۔ "اپنی بہو سے پوچھئے۔" یہ کہہ کر سقراط جیسے اپنے باپ کے سوال کا جواب دینے کے فرض سے عہدہ برآ ہو گیا۔

پھر نگینہ بڑے اطمینان اور آسودگی سے چلتی ہوئی آئی اور بولی۔ "وہ میرا تحفہ تھا نکل میں نے استعمال کر لیا۔"

چند لمحے تک نگینہ کے سوا سب بت بنے کھڑے رہے۔ پھر سید امجد حسین نے جلدی سے جیب میں سے رومال نکال کر اسے اپنے دانتوں میں دبا لیا اور جیسے لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

دلاور کار کو آہستہ آہستہ گیراج کے دروازے تک لے گیا۔ اکبر سر جھکائے واپس جانے لگا۔ تب نگینہ نے سقراط کو داد دی۔ "بالکل وہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہو گا۔"

"ہم نے فلسفہ پڑھا ہے گھاس نہیں کھودی ہے۔" سقراط بولا۔ "اور اب یوں ہو گا کہ رات دوران کے بعد انھیں صبر آجائے گا۔"

پھر اکبر ان کے قریب سے تیز تیز چلتا ہوا گزرا۔ "بڑے صاحب نے گھنٹی بجائی ہے۔" اس نے دونوں کو جیسے کوئی بہت ضروری اطلاع دی۔

فوراً بعد وہ واپس آیا اور بولا۔ "صاحب نے اندر بلایا ہے۔ اپنے اوپر والے کمرے میں۔ آپ دونوں کو۔"

سقراط نے نگینہ کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور ٹائی کی گرہ درست کی۔ پھر دونوں اندر چلے گئے۔

جب انھوں نے سید امجد حسین کے کمرے کا پردہ اٹھایا تو وہ پردے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ فوراً بولا۔ "میں نے تمھیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ پھر یہاں نہ آنا جب مردے کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو ساری دنیا سے اس کا پردہ ہو جاتا ہے

اب میرا تمہارا پردہ ہے۔ جاؤ"

وہ دیکھتا رہا کہ اس کی یاد میں پہلی بار اس کمرے کی کھڑکی میں چاند چمکا تھا۔ اسے یاد آیا، اس نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض لوگ چاند کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں تو وہ خوب ہنسا تھا اور کہا تھا کہ چاند کی سی خوبصورت چیز کو دیکھ کر صرف وہی لوگ پاگل ہو سکتے ہیں جو پہلے سے پاگل ہوں۔ اور آج اسے چاند سے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی تو شیشوں کے پار چاند اتنا اداس ہو گیا کہ نیلا پڑ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ کمرہ بھی وہی ہے۔ کھڑکی بھی وہی ہے مگر بڑ کے کٹنے سے سب کچھ کتنا بدل گیا ہے جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی ہوٹل میں پڑا ہے۔ پھر تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا تو کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پردہ پھڑپھڑانے لگا اسے یوں لگا جیسے ہوا کے ساتھ چاند بھی اس کے کمرے میں گھسا چلا آئے گا اور سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور ساری دنیا کی راتیں قیامت تک کے لئے اندھیری ہو جائیں گی۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہے یا سویا بھی ہے صبح کو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا اور آنکھوں میں درد تھا اور کان گونج رہے تھے اٹھ کر اس نے کھڑکی کھولی تو چڑیوں کا ایک غول آیا اور "شاں" کی آواز کے ساتھ کھڑکی کے پاس سے گزر کر اوپر اٹھ گیا۔ کیا یہ چڑیاں اس کے پاس تعزیت کرنے آئی تھیں! پھر ابھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن سیدھی اس کھڑکی میں سے گزر کر سامنے کی دیوار میں تلوار کی طرح گڑ گئی۔ بڑ اپنے ساتھ اس کا احساس تحفظ بھی لے گیا تھا۔ ہر چیز اندر گھسی چلی آ رہی تھی۔ ہوا بھی اور دھوپ بھی اور چھت تک جاتی ہوئی بیل بھی۔ اس نے کھڑکی کو بند کیا تو بیل کا ایک پتہ کٹ کر اس کے قدموں میں لوٹ گیا۔ سید امجد حسین نے یہ پتہ یوں اٹھایا جیسے بڑ کا پورا درخت اس کی مٹھی میں آگیا ہے پھر جیسے وہ اتنے زیادہ بوجھ کو سہار نہ سکا اور اس بڑ کے نیچے دب کر مر گیا۔

نہ جانے وہ رو رہا تھا یا سو گیا تھا یا بیہوش سا ہو گیا تھا۔ بہر حال جب وہ اکبر کی دستک سے جاگا تو صبح کو کھڑکی میں سے آتی ہوئی جو دھوپ سامنے کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ وہ کمرے کے سارے

فرش کا سفر طے کر کے واپس کھڑکی کے قدموں میں سمٹ گئی تھی "یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اور باہر سے اکبر کی عاجزی سے بھری ہوئی آواز آئی "چھوٹے صاحب کہتے ہیں حضور کہ آپ نے ناشتہ نہیں کیا تو اب کھانا تو کھا لیجئے"

"چھوٹے صاحب سے کہو کہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے" اس نے بند دروازے کے پاس دانت پیس کر کہا۔

شام کو بھی یہی ہوا۔ اکبر نے باہر سے منت کی کہ چائے کی ایک، صرف ایک پیالی ہی پی لیجئے" مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

وہ پھر نہ جانے رونے لگا یا سو گیا یا بے ہوش ہو گیا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند کھڑکی میں چمک رہا تھا اور کل کی طرح نیلا پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ کسی آواز سے چونکا۔ اٹھ کر روشنی جلائی پھر اس کمرے سے ملحق مطالعے والے کمرے میں گیا اور وہاں سے وہ سیڑھی اٹھا لایا جو اس نے اونچے آبنوسی شیلفوں کے بالائی حصوں سے کتابیں اتارنے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کے اس روشن دان تک سیڑھی لگائی جس کے شیشوں کو کسی زمانے میں بڑ کے پتے چھوتے تھے اور جب وہ ہوا میں ہلتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس پورے بنگلے کی پیٹھ کھجا رہے ہیں۔

سید امجد حسین نے روشنی بجھا دی اور چوروں کی طرح اوپر چڑھ کر روشندان میں سے بنگلے کے اس حصے میں جھانکنے لگا جہاں بڑ کا خون ہوا تھا۔

وہاں اس نے دیکھا کہ چاروں طرف دھکی ہوئی دودھیا برقی روشنیوں کی ایک قطار ہے جس نے ایک بہت وسیع لان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ لان میں گھاس غالیچے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ لان کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریوں کا ایک چوڑا حاشیہ ہے۔ برقی روشنیوں میں یہ کیاریاں بالکل اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسی دن کو نظر آتی ہوں گی۔ ہر کیاری میں دوسری کیاری سے مختلف رنگ کے پھول ہیں کسی میں سرخ کسی میں زرد، کسی میں نیلے۔ وسیع لان کے وسط میں، جہاں بڑ کا تنا ہوتا تھا۔ گلاب کے پودوں کا ایک بڑا سا دائرہ ہے جس کے درمیان میں شفاف پتھروں کا ایک چبوترہ ابھرا ہوا

ہے۔ پتھروں کے کہیں نیچے برقی روشنی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے لہریئے پتھر چمک رہے ہیں اور چبوترے پر رکھی ہوئی سبک کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سقراط اور نگینہ ایسے لگ رہے ہیں جیسے وہ دھوپ سے چمکتے ہوئے تالاب میں تیرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کافی پی رہے ہیں اور بات بات پر ہنس دیتے ہیں۔ پھر وہ اٹھتے ہیں۔ نگینہ گلاب کے ایک بڑے سے پھول کو دونوں ہاتھوں میں بڑے پیار سے لے کر سونگھتی ہے اور پھر اسے چومتی ہے۔ سقراط اس پھول کو توڑ کر اس کے بالوں میں لگاتا ہے مگر پھول بڑا ہے اس لیے نگینہ کے بالوں میں رکتا نہیں ہے۔ چنانچہ سقراط پھول کو پتی پتی کر کے اسے نگینہ پر برسا دیتا ہے اور نگینہ اس سے لپٹ جاتی ہے۔ پھر وہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس ٹہلنے لگتے ہیں۔ ہر چند قدم کے بعد سقراط نگینہ کو اپنے بازو میں سمیٹ کر اسے پیار کرتا ہے۔ وہ گھومتے ہوئے جب سید امجد حسین کے کمرے کے نیچے سے گزرتے ہیں تو ان کی باتیں اسے سنائی دے جاتی ہیں۔ وہ پھولوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان پھولوں کی کوئی قسم انگلینڈ سے آئی ہے اور کوئی ہالینڈ سے انھوں نے کسی دوست سے کہہ کر امریکہ اور جاپان سے بھی پھول منگا رکھے ہیں۔ پھر ایک بار سقراط نگینہ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اسی کی جرأت نے اس گھر پر سے بڑ کا آسیب دور کیا۔ "آسیب؟" وہ احتجاج کرتی ہے۔ "یہ تو میرا تحفہ تھا۔ جو میں نے انکل سے زبردستی چھینا ہے"، اس پر دونوں زور سے ہنستے ہیں اور دونوں ایک دم خاموش ہو کر اوپر جیسے روشندان کی طرف دیکھتے ہیں۔

سید امجد حسین کو یوں لگا جیسے انھوں نے اسے روشندان میں سے جھانکتے دیکھ لیا ہے۔ وہ تیزی سے اترا اور سیڑھی کو مطالعے کے کمرے میں رکھ کر اپنے پلنگ پر آ گرا۔ چند لمحوں تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر ایک دم یوں تڑپ کر اٹھا جیسے اس روز اٹھا تھا جب سقراط نے پہلی بار اس سے بڑ کو کاٹنے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے روشنی جلائی اور ننگے پاؤں کمرے سے نکلا اور خاصی دیر تک سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبکا کھڑا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھنے لگا ہے۔ بچوں کی سی پھرتی

سے وہ اپنے کمرے میں آیا اور دروازے کو آہستہ سے بھیڑ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس نے دروازے کی دستک پہچان لی "کیا ہے اکبر؟" اس نے پوچھا مگر اب اس کے لہجے میں تلخی نہیں تھی۔

اکبر کا جواب آیا "صاحب جی اب تو کھانا کھا لیجئے نا"

امجد حسین نے کہا "جی چاہے گا تو منگا لوں گا"

اکبر پھر بولا "حضور، چھوٹے صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار پھر جا کے کہو"

سید امجد حسین نے ذرا سا سوچا۔ پھر بولا "اچھا تو لے آؤ"

اکبر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑا سا طشت میز پر رکھ کر بولا "لگا دوں صاحب؟"

"میں کھا لوں گا" اس نے کہا "چھوٹے صاحب کو بھی بتا دو کہ اب وہ اطمینان سے سو جائیں۔ سالن آچار ہی ہو تو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے۔ تم یہ برتن صبح کو لے جانا۔ میں کھانا کھانے کے فوراً بعد سو جاؤں گا"

سید امجد حسین کے مزاج میں اس خوشگوار تبدیلی سے اکبر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ وہ جانے لگا تو امجد حسین نے پوچھا "سقراط آگیا اپنے کمرے میں؟"

"جی نہیں" اکبر بولا "ابھی ابھی کچن میں آئے تھے۔ آپ کو کھانا کھلانے کی تاکید کر کے چلے گئے"

"اس سے کہنا" امجد حسین نے کہا "میں نے کھانا کھا لیا ہے اور میں سو رہا ہوں"

"جی اچھا" اکبر چلا گیا۔

فوراً بعد امجد حسین پھر اٹھا۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا اپنے کمرے میں سے نکلا اور سیڑھیوں کے ایک موڑ میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سنا کہ سقراط اور نگینہ کو اکبر اس کے کھانا کھانے اور سو جانے کی خوش خبری سنا رہا ہے۔ تب نگینہ بولی "بھئی حد ہے ساقی۔ بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ تم نے کہا تھا کہ ہوگا" اور سقراط بولا "ہم نے فلسفہ پڑھا ہے گھاس نہیں کھودی ہے"

صبح کو سقراط اور نگینہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے میں سے نکلے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سید امجد حسین برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس نے بھی ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا ہے اس کے دونوں ہاتھ گاؤن کی جیبوں میں ہیں اور وہ سامنے میز پر جمعہ کا تازہ اخبار پڑھ رہا ہے۔ سقراط اور نگینہ نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں اس کے پاس آ گئے۔

"السلام علیکم اباجی!" سقراط بولا۔

"وعلیکم السلام!" امجد حسین نے سر اٹھا کر جواب دیا "جیتے رہو"

"آداب انکل!" نگینہ بولی۔

"جیتی رہو" امجد حسین نے پیار سے جواب دیا اور پھر اخبار پر جھک گیا۔ سقراط اور نگینہ کے چہرے کھل اٹھے۔ پھر سقراط نے نگینہ کو جانے کا اشارہ کیا اور خود ہولے ہولے آہستہ سے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اچانک نگینہ کی ایک وحشت ناک چیخ سنائی دی ــــ "ساقی! ـــ ساقی!" وہ ہیسٹریا کے مریضوں کی طرح پکارنے لگی۔

سقراط بجلی کی سی تیزی سے لپکا مگر سید امجد حسین اخبار پڑھنے میں مشغول رہا۔

پھر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ نگینہ کے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں اور سقراط شاید نوکروں کو گھرکتا اور ڈپٹتا رہا۔ پھر نگینہ کی چیخیں قریب آنے لگیں اور سید امجد حسین نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے سوچا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کتنے بھونڈے انداز میں روتی ہے۔

سقراط روتی اور تڑپتی ہوئی نگینہ کو سنبھالتا ہوا آیا اور اسے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ نکلا تو سید امجد حسین نے پوچھا "کیوں بیٹا! کیا ہوا؟"

سقراط بولا "رات کو کسی خبیث نے ہماری ساری پھلواری کا ناس مار دیا ہے اباجی۔ پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔ پودے اکھیڑ کر پٹخ دیئے ہیں۔ اتنی بے رحمی

سے پھلواری کو اجاڑا ہے کہ کوئی جانور ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ کسی انسان کا کام ہے۔ نگینہ نے اپنے ہاتھوں سے پھولوں کی ان کیاریوں میں گوڑی کی اور کھرپا چلایا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے"
اور سید امجد حسین نے سقراط کی بات کاٹ کر کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹا، مگر اس میں رونے چیخنے کی کون سی بات ہے؟"

سقراط جیسے شکست کھا کر پلٹ گیا۔ تب سید امجد حسین نے انگڑائی لینے کے لئے گاؤن میں سے ہاتھ نکالے اور انگڑائی لے کر انھیں اخبار پر رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلیوں پر لہو جما ہوا تھا اور پوروں میں گلاب کے کانٹے چبھے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کسی فاتح کے ہونٹوں پر ہونی چاہئے اور وہ یہ سوچے بغیر زور زور سے ہنسنے لگا کہ سقراط اور نگینہ کیا سوچیں گے۔

جیلانی بانو

ایک سالگرہ

آنٹی پورے پچاس کی ہو چکی تھیں۔ آج ان کی اکاونویں سالگرہ تھی۔

"زرنگار" کے احاطے میں اور باہر شاہراہ پر دور دور تک نئے نئے رنگوں اور نئی نئی وضع کی نئی نئی کاریں چمک رہی تھیں ۔۔۔ کاریں آ رہی تھیں خالی ہو رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ اندر ڈرائنگ روم، لونگ رومز، بیڈ رومز، ڈائننگ روم اور برآمدے ہر نسل اور ہر فرقے کے مردوں اور عورتوں سے بھرے جا رہے تھے، ہر طرح کی خوشبوؤں سے فضا مہک رہی تھی، حسن و زیبائش کے پیکروں سے ماحول جگمگا رہا تھا۔

آنٹی بڑی خوش خلقی اور خوش مزاجی سے اپنے مہمانوں کا استقبال بھی کر رہی تھیں اور خبر گیری بھی میں نے اس سے پہلے انٹی کو کبھی ایسے سنگھار میں نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے سیلفون کی سیاہ فرنچ ساڑی پہن رکھی تھی جس پر سنہرے نقوش بنے تھے۔ اس سال کی گرمیوں میں جب وہ یورپ گئی تھیں تو بیگم آغاخان نے انھیں بطور تحفہ یہ ساڑی پیش کی تھی اس کے ساتھ بیر بہوٹی جیسا سرخ بغیر آستینوں کا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں جس کی تراش خاص ان کی فرمائش پر اسی موقع کے لئے بالکل اچھوتے ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ سوئٹیزرلینڈ کے دوران سیاحت میں خریدی ہوئی پلاٹینم کی گھڑی جس کے کانٹے بھی پلاٹینم کے تھے اور ہندسے ہیرے کے۔ دائیں کلائی پر پلاٹینم ہی کے جالی دار توڑے سے بندھی تھی۔ بائیں کلائی میں زمرد کے ننھے ننھے نگینوں کا بریسلٹ تھا۔ بڑے بڑے اصلی موتیوں کا ہار سینے پر لٹک رہا تھا اور ڈنمارک کا بنا ہوا ہیروں سے مرصع گلوبند اس کے اوپر تھا جس کے بیچوں بیچ آنسو کی شکل میں تراشا ہوا بڑا سا نیلم چمک رہا تھا۔ کانوں کی لووں سے ہیروں کے جھاڑ لٹک رہے تھے۔ دن بھر کے بیوٹی ٹریٹ منٹ کے بعد ان کی

گلابی جلد کی طنابیں کھنچ گئی تھیں، سنگترے کے چھلکے جیسی جلد سیب کے چھلکے جیسی ہو گئی تھی۔ جدید طرز کے کٹے ہوئے بال گردن اور کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پیشانی کے درمیان سے ذرا ہٹ کر کوئی دو انگل چوڑی سفید دھاری پشت کو جاتے جاتے پھیل کر بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔ اور آنٹی کی وجاہت کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں عجیب سا نور تھا۔

ہر سال کی رسم کے مطابق جیسے ہی مرتعش چائمز نے نو بجائے جوان کی پیدائش کا وقت تھا، آنٹی نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا ہر طرف سے نغمہ بلند ہوا "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ....."

"زرنگار" میں اس سے بڑی دعوت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، اور آنٹی کے ولولے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہو رہی تھی کیونکہ آنٹی پچاس سال سے زیادہ جینا وبال سمجھتی تھیں اور پچاس سے اوپر کی زندگی کے تصور ہی سے گھبراتی تھیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان تھا کہ آنٹی اب زندگی کی ان بوجھی ان دیکھی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے خوفزدہ ہونے کی بجائے ایک اور سنگ میل کے گزرنے پر اتنی مسرور تھیں۔ پورے پچاس سال انھوں نے گزار دیئے تھے۔

پچھلے سال ہی کی تو بات ہے جب کہ میں آنٹی کے ساتھ کھنڈالا کی ایک سربلند چوٹی پر بیٹھا تھا ہم افق تک پھیلے ہوئے اور پہنچے ہوئے سلسلۂ کوہ اور بیچ بیچ میں ان پہاڑوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا رکھنے والی سیکڑوں فٹ گہری اور خوفناک کھائیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے سبزے کا میلوں پتہ نہ تھا۔ زردی مائل بس منظر دور ہوتے ہوتے بھورا ہو رہا تھا اور دور آسمان اور زمین کے اتصال پر بہم سرمئی خاکے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ منظر بڑا پرسکون تھا مگر یہ سوچ کر دہشت سی ہوتی تھی کہ یہ پہاڑ جس کے سر پر ہم سوار ہیں اگر نیچے سے کھسک گیا تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ ویسے یہ سوچنے کی کوئی وجہ تو نہ تھی۔ بس ایک یونہی سا خیال آ گیا اور عجیب اتفاق تھا کہ آنٹی بھی کچھ اس قسم کی بات سوچ رہی تھیں۔

"ڈارلنگ سیلوز" میں یہاں سے گر کر مر جاؤں" وہ اپنی مخصوص زبان میں بولیں۔ "جوان کی

عادت تھی۔ یعنی انگریزی الفاظ کا بہت استعمال کرتی تھیں، اور بعض دفعہ تو جملے کے جملے بھی بول جاتی تھیں وہ یہ سوچ کر آئی شڈر۔ میں تو مرنا ہی نہیں چاہتی۔ نہ ایکسی ڈنٹ سے۔ نہ سوئسائڈ کر کے، نہ کسی اور طرح، ہاؤ ایور آئی ہیو ناٹ یٹ ڈی سائڈڈ کہ میں کیسے مروں گی۔ موت سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"آپ موت کے بارے میں سوچتی ہی کیوں ہیں۔؟"

"کیوں نہیں سوچوں۔ میں مرنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن ففٹی کی ہو کر جینا بھی تو نہیں چاہتی۔ کیوں کہ پھر لائف بی کمس سو مزریبل، یو نو۔"

میں چکرایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سب سے آسان موت ہارٹ فیل ہے۔" آنٹی نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا۔

"اس میں کوئی لمبی چوڑی تکلیف نہیں ہوتی۔ یو نو۔ آئی ڈونٹ لائک سفرنگ۔ نہ اپنی نہ دوسروں کی۔ تم بیلیو نہیں کرو گے کہ میں نے آج تک کسی ان سکٹ تک کو نہیں مارا۔ ہر طرح کی پارٹیوں میں پارٹی سی پیٹ کیا مگر ہنٹنگ پارٹی میں کبھی نہیں گئی۔ کسی فیونرل میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہاؤ ہائی وڈ فیس دی ڈیتھ، اسپشلی بڑھاپے میں کبھی کبھی ڈاؤٹ ہونے لگتا ہے کہ شاید کوئی خدا ہے اور پھر آئی پرے ٹو ہم کہ مجھے ہارٹ فیل سے مارنا، اور جب میرا ایمان لوٹ آتا ہے کہ خدا وا کوئی نہیں تو ڈٹرمن کرنے لگتی ہوں کہ ہارٹ فیل سے آرام سے مروں گی تاکہ مجھے مرنے میں کوئی ٹربل نہ ہو۔

"و چلیے آنٹی دیر ہو رہی ہے۔ رات کو ہائی وے پر ٹرکیں بہت چلتی ہیں۔ بمبئی پہنچنے میں ہمیں دیر ہو جائے گی۔"

ہم پہاڑ سے اتر آئے۔ راستہ بھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہماری کار کھنڈالا کے پیچ پیچ اور نیم تاریک نشیبی زاویوں سے چلی جا رہی تھی ہم دونوں خاموش تھے خاموشی وحشت ناک تھی۔

ویسے آنٹی شاید ہی کبھی خاموش رہتی ہوں گی۔ اور ان کی باتوں میں بات کرنا بڑے دل گردے

کی بات ہے۔ اس بات کا احساس مجھے ان سے پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ ان سے میری یہ پہلی ملاقات چند سال پہلے ہوئی تھی۔

میں جس تشہیری ادارے میں ملازم تھا اس کے مالک سے میرے تعلقات بہت ہی دوستانہ تھے وہ میری کارکردگی سے متاثر تھا اور بس اس کی خوشحالی سے۔ اکثر شامیں ہم ساتھ گزارا کرتے تھے، ایک دن اس نے کہا۔

" آج میں تمھیں ایک خاص آنٹی کے پاس لے چلوں گا "

میں اب تک اس کی کبھی اصلی اور منھ بولی آنٹیوں سے مل کر بہت بور ہو چکا تھا۔

یہ کون سی آنٹی ہیں ؟" میں نے بددلی سے پوچھا۔

یہ دراصل ساری دنیا کی آنٹی ہیں۔ تم انھیں شیطان کی آنٹی بھی کہہ سکتے ہو "

اس مختصر سے غائبانہ تعارف کے بعد ہم ان آنٹی کے بنگلے پر پہنچے۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی خواب آور دوا کے زیر اثر میں خوابوں کے جزیرے پر پرواز کرنے لگا۔

یہ ایک ایر کنڈیشنڈ ہال تھا۔ جو الٹرا ماڈرن ذوق اور مزاج کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار فیروزی رنگ کی تھی، ایک بنفشئی سرخ ایک گہری سرمئی، اور ایک ہلکے سبز رنگ کی جس پر کیوبک اسٹائل میں زرد، سفید اور نارنجی خاکے تھے جن کا موضوع سکون اور تازگی تھا۔ تازہ ترین ہاج اور ڈیزائن کے پردے الگ الگ رنگوں اور ناپ کے غالیچے، الگ الگ رنگ اور وضع کے صوفوں کے نیچے بچھے تھے۔ خوش ذوقی اور حسن کارانہ طور پر ترتیب دیے ہوئے پھول، بیش قیمت اور نادر گلدانوں میں سجے تھے، دیواروں اور چھت کی مخفی روشنی مصنوعی چاندنی کی طرح چھٹکی ہوئی تھی۔ جس کی برائے نام روشنی میں وہاں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں کے خدوخال سے ان کی تمناؤں اور حسرتوں کے تاریک گوشے ابھر رہے تھے۔ چھت سے آویزاں پرسکون بلوری جھاڑ کے گوشواروں میں مخفی روشنی کے انعکاس سے دھیمی سی چمک رہی تھیں۔

طرح طرح کے پھولوں اور خوشبوؤں کی مہک سے تمباکو کی بو اور سگریٹوں کا گھٹا ہوا دھواں خلط ملط ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں میں سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار عورت ہماری طرف بڑھتی چلی آئی منقش سنہری فریم کے چشمے میں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دہک رہی تھیں اور پھیکے پھیکے لپ اسٹک والے ہونٹ ااستقبالیہ مسکراہٹ لئے ہوئے تھے ا ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ابتدائی رسمی گفتگو اور مصافحے کے بعد میرے دوست نے ان سے میرا تعارف کرا دیا۔ یہ تھیں وہ آنٹی۔

ہاؤ ڈو یو ڈو؟" آنٹی نے میرے جواب میں کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

وسیع وعریض ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں دیوان پر انھوں نے ہمیں بٹھا دیا۔ میرے دوست نے دور بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں کو اشارہ کیا اور دونوں جیسے ایک دکھائی نہ دینے والے دھاگے سے بندھی چلی آئیں۔ ایک دھان پان گجراتی اور دوسری اونچی پوری پنجابی۔ بیرا بھی آگیا اور میرے دوست نے اسکاچ کا آرڈر دیا۔

"انجوائے یورسلوز بوائز" یہ کہہ کر آنٹی کچھ نووارد مہمانوں کی مدارات کو چلی گئیں۔

بوتل آئی، گلاس آئے، سوڈا آیا، جام ٹکرائے، گھونٹ اترے، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ چلی، مگر میں اس چھیڑ چھاڑ میں شریک نہ تھا۔ مخفی روشنی کے آدھے سے زیادہ اندھیرے میں میری نگاہیں دوسری شکلوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر ایک مشہور فلمی ہیرو دکھائی دیا۔ جس کے ساتھ ایک نامور پروڈیوسر اور ایک کامیاب ڈائریکٹر بھی بیٹھا تھا۔ ان کے حلقے میں پانچ عورتیں بیٹھی ان کے ساتھ پی رہی تھیں، ان تینوں کی آنکھوں سے شراب کے ساتھ ساتھ دولت اور عیاشی کا نشہ بھی آشکار تھا۔ ان پانچوں کی آنکھوں میں تجربے کاری اور خود اعتمادی کا نشہ بھرپور تھا۔ وہ ان کا شکار کر رہے تھے اور یہ انکا شکار کر رہی تھیں۔

ایک جگہ ایک بھاری بھرکم تندیل مارواڑی جو ساٹھ کے لگ بھگ ہوگا کھادی کے نہایت ہی اجلے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے تلے ہوئے گردے اور جھینگے کھا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ برابر بیٹھی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کی ران پر بار بار مار تا رہا تھا جو چپکے چپکے مسکرا تی

ہوئی تھوڑی تھوڑی دیر سے چسکی لیتی رہتی تھی۔ دور ہی سے لگتا تھا کہ وہ اس سے گندے لطیفے سن رہی تھی۔

درمیانی میز کے گرد صوفوں پر تین نوجوان اپنی آبائی دولت کا فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے ایک ایک کمسن لڑکی پہلو میں لئے بیٹھے پی رہے تھے۔ ان کی بات چیت کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ یورپ کے پچھلے سفر کا ذکر ہو رہا تھا، یا نئی شاندار اور قیمتی کاروں کی خرید و فروخت کا۔

ایک کونے میں بہت دور بہت بڑھیا سوٹ میں ایک درمیانی عمر کا متین آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک گداز بدن بنگالی عورت تھی، شراب کی بوتل اور آدھے آدھے گلاس سامنے میز پر رکھے تھے۔ دونوں سگریٹ پھونک رہے تھے دونوں خاموش تھے۔

ایک طرف صرف کچھ عورتیں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت بے کار اور بے روزگار تھیں۔ شاید ہر ایک کو امید ہوگی کہ اس کا اپنا کوئی گاہک بس آتا ہی ہوگا۔ آنٹی بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ آنٹی کو میں غور سے دیکھنے ہی لگا تھا کہ ان سے نگاہیں چار ہوئیں۔ اور وہ فوراً میری طرف آنے لگیں۔ میں اپنے جائزے اور خیالات سے چونکا۔ تو پتہ چلا کہ میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میرا دوست اس پنجابی عورت کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا تھا اور وہ دھان پان گجراتی لڑکی فلمی ہیرو کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"تم اکیلے کیوں بیٹھے ہو ڈارلنگ؟" آنٹی میرے سامنے کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی..... وہ یونہی میں گھبرا سا گیا۔

"شوق نہیں کرو گے؟ اندر بہت سے ویکینٹ روم ہیں۔"

"جی نہیں شکریہ۔ میں یہ شوق نہیں کرتا۔"

"سچ؟" یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس بیٹھ گئیں "یہاں تو جو بھی آتا ہے جسٹ ٹو ہیو فن اینڈ گڈ ٹائم۔"

جی ہاں۔ مگر میں اپنے دوست کے ساتھ یوں ہی چلا آیا تھا۔"

تم ان کی فرم میں پبلک ریلیشنز آفیسر ہو؟"

"جی"

"یہ بھی تو ایک اسٹیبلشمنٹ آف پبلک ریلیشنز ہے۔" آنٹی نے فوراً ایسی سنجیدگی سے جوڑ ملایا کہ میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم میریڈ ہو؟" آنٹی نے پینترا بدلا۔

"جی نہیں۔"

"گڈ گریشیس! کنوارے ہو کر ایسے خشک مزاج ہو، کمال ہے۔" انھوں نے بڑی حیرت ظاہر کی۔

ان کی یہ سب ہی باتیں محض ایک اور گاہک حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ اور میں ان کے مال بیچنے کی ماہرانہ صلاحیت کا دل ہی دل میں قائل ہو گیا۔

"امپاسبل۔" کچھ دیر رک کر جیسے انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔

"بات یہ ہے آنٹی... کہ میں اس کام کو، اس پیشے کو، اس ماحول کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

"واٹ؟" آنٹی چونکیں اور کچھ دیر تو بس مجھے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پھر اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے بولیں "آج تک میرے منھ پر ـــــ نو ون ٹولڈ لائک دِس۔"

اب میرے بدحواس ہونے کی باری تھی، آنٹی کے گھر میں بیٹھ کر میں نے ان سے ایسی بات کہہ دی جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگی تھی۔ میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"آئی ایم سو ساری۔" اور میں جانے لگا۔

"سٹ ڈاؤن۔" آنٹی نے کچھ ایسی خود اعتمادی سے حکم دیا کہ میں ایک پٹے ہوئے شریر لڑکے کی طرح ان کی حکم عدولی نہ کر سکا اور بیٹھ گیا۔

"میں نے کچھ مائنڈ نہیں کیا۔ بلکہ مجھے تمھاری فرینکنس پر حیرت ہے۔ آئی ایڈمائر یو۔ سچ میں تو ہول لائف تم جیسے آدمی کی راہ دیکھ رہی تھی، جو آنسٹ اور ٹرتھ فل ہو۔ کوئی اپنے آپ کو کس کر چانٹا نہیں مار سکتا۔ ایسے سلیپ کے لئے دوسرے کا ہینڈ چاہئے...." اور

نہ جانے آنٹی کیا کیا کہتی رہیں۔

اگر میں کوئی ریفارمر ہوتا تو آنٹی کی باتوں سے مجھے بے حد مسرت ہوتی۔ مگر اس وقت ان کی باتوں سے مجھے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ انھوں نے مجھے ریفارمر کا رتبہ دے دیا تھا۔

بڑا عمدہ ڈنر کھلا کر میرے دوست کے ساتھ جب وہ مجھے رخصت کرنے لگیں تو مجھ سے دوسرے دن بھی آنے کا وعدہ لے لیا۔ دوسرے دن انھوں نے مجھے اکثر آتے رہنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔ اور میں اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ بہت جلد ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے اور کچھ ہی عرصہ میں یہ نوبت آگئی کہ مجھ سے زیادہ ان کا منہ چڑھا کوئی نہ تھا۔ بغیر کسی غرض اور مطلب کے ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھے میری بے باکی اور اصول پرستی کے لئے عزیز رکھتی تھیں اور میں ان کی شفقت اور پیچیدگی کردار کے سبب ان میں دلچسپی لینے لگا۔

آنٹی کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ اس قدر ہر دلعزیز تھیں کہ عوام کے بھی ہر دلعزیز اداکار، ممثلائیں، فنکار، ادیب اور سیاسی رہنما ان پر نچھاور ہوئے جاتے تھے۔ بمبئی کے اونچے طبقے کی کوئی تقریب، کوئی محفل اور کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا جس میں وہ مدعو اور موجود نہ ہوتیں۔ ایوز ویکلی اور آن لوکر کی کوئی اشاعت ایسی نہ ہوتی تھی جس میں وہ کسی سماجی اجتماع کی تصویر میں اپنی جھلک نہ دکھا رہی ہوں۔ کسی غیر ملکی ڈی۔آئی۔پی کے استقبال کے لئے گیٹ وے آف انڈیا یا سینٹا کروز ایروڈرم پر وزرا، شیرف، غیر ملکی قونصلوں اور عمائدین شہر کے ساتھ وہ بھی دکھائی دیتیں۔ پرسیتیج فلموں کے پریمیر یا مہورت پر، برابورن اسٹیڈیم میں کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں، بمبئی جیمخانہ کے بین الاقوامی ٹینس چمپین شپ کے مقابلوں میں کوپریج پریڈ اس گیپ کے نٹ بال ٹورنامنٹ میں، بیرڈز، اسنوکر، گاف اور بیراکی کے مقابلوں میں، اتھلٹکس کاؤس جی جہانگیر ہال کے نیم سیاسی جلسوں میں، مغربی موسیقی کے کنسرٹ میں، جہانگیری آرٹ گیلری میں پینٹنگ کی نمائشوں میں، رنگ بھون کے اوپن ایئر حیرانی مشاعروں میں

بھارتیہ ودیا بھون کے ڈراموں، برلا تو شری سبھا گھر کے پروگراموں، سر سنگار سمندر کے میوزیکل فلیسٹول اور مہالکشمی ریس کورس کی ہر ایک میٹنگ میں آنٹی اپنے نہایت ہی فنکارانہ ذوق کے ملبوس اور نئی نئی وضع کے بیش قیمت زیورات پہنے اپنی مخصوص تمکنت اور وقار کے ساتھ نمایاں طور پر ضرور شرکت کرتیں۔ سب ہی ان کو آنٹی پکارتے تھے۔ اجتماعی تصویروں کے نیچے اور سماجی خبروں میں ان کا ایک نام ضرور چھپتا تھا۔ مگر وہ اصلی نہیں تھا۔ کسی کو ان کے اصلی نام اور کسی اور اصلیت کا پتہ نہ تھا۔ بہت سے ایرسٹوکریسی کے لوگوں کو ان کے کاروبار کا پتہ نہ تھا۔ اس سے زیادہ نہ وہ جاننا چاہتے تھے۔ اور نہ جاننے کی ان کو کوئی خاص ضرورت تھی۔ آنٹی کا کاروبار ملابار ہل پر ان کی اپنی کوٹھی "زرنگار" میں ہوتا تھا۔

جب سورج تاریکیوں میں کھو جاتا تو "زرنگار" میں سویرا ہونے لگتا، آنٹی کو ان سومینا کی شکایت تھی، اس لئے وہ دن کو ہی سوتی تھیں۔ سرِ شام ہی ملازم ڈرائنگ روم، خوابگاہوں برآمدوں، گیلریوں اور ٹیرس کی صفائی کرنے لگتے۔ آنٹی جب روز کی طرح ایک نئی عورت بن کر کمرے سے برآمد ہوتیں تو سب سے پہلے سارے گھر کا جائزہ لیتیں۔ ہر چیز بڑے قرینے سے اپنی جگہ رکھی صاف ستھری دکھائی دیتی۔ فرش، دروازے کھڑکیاں شیشے چمکتے دکھائی دیتے جگہ جگہ رکھے ہوئے گلدانوں میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو پھول مہکتے رہتے۔ معطر خوابگاہوں میں تکیوں پر اجلے اجلے غلاف رہتے اور بستروں پر اجلی اجلی چادریں ہوتیں۔ جن پر تہوں سے پیدا ہونے والی شکنیں کہیں ابھری ہوئی اور کہیں دبی ہوئی لکیروں کی شکل میں لپٹی رہتیں۔ سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر آنٹی دیکھ لیتیں کہ مخصوص ضرورت کے پیکٹ اور چھوٹے تولیے ان میں رکھے ہیں۔ ہر طرف اطمینان کر کے وہ برآمدے میں چلی آتیں۔۔ پورے بغیچے اور "ان" کے گیٹ سے پورٹیکو تک آنے والے اور پورٹیکو سے "آؤٹ" کے گیٹ تک جانے والے راستے پر نظر دوڑاتیں۔ اگر کچھ دکھائی دے جاتا تو مالیوں کو ڈانٹتیں۔

"یو بلڈی سوائن — وہ دیکھ وہاں ایک پتہ پڑا ہے! اٹھا جلدی سے۔

ادھر دیکھیو اسکنگ، وہاں پھول گرا پڑا ہے، پھینک اسے۔
نئی نئی آبیاری سے اٹھنے والی پھولوں اور پتیوں کی خوشبو میں ایک گہری سانس لے کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آتیں اور ریڈیو پر کہیں سے مغربی موسیقی کا پروگرام دھیمے سروں میں لگاتیں پھر مختلف تپائیوں اور میزوں پر رکھے ہوئے طرح طرح کے ڈبوں میں سے کسی ایک سے سگریٹ نکال کے جلاتیں اور کسی ایک صوفے پر آرام سے بیٹھ جاتیں۔
اب اتنا وقت ہو جاتا کہ ستارے ایک کے بعد ایک اترنے لگتے اور ان کی وقتی پرستش کرنے والے ان کے گرد جمع ہونے لگتے — یہ زہرہ جبیں قوم اور مذہب سے بے نیاز ہوتی تھیں جیسا کہ اس پیشے کا قاعدہ ہے۔ لیکن شناخت کے لئے ہر قوم اور مذہب کی ہوتی تھیں۔ اسی طرح گاہک ہوا کرتے تھے۔

سرکاری مصروفیات سے بوکھلائے ہوئے بڑے بڑے عہدے دار۔ کاروباری الجھنوں سے گھبرائے ہوئے تجار، ایسے نئے اور خام دولتمند جن کو سرور کام و دہن کا بڑا شوق تھا یا ہوس پرستی کو جنھوں نے اپنا شعار بنالیا تھا وہاں آجایا کرتے۔ اپنی بوتل الگ لے کر بیٹھ جاتے۔ یا ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان بنے ہوئے بار سے جام لینے جاتے اپنی اپنی نازنین کے ساتھ کچھ ٹیرس پر چلے جاتے۔ کچھ خوابگاہوں میں چھپ جاتے۔ کچھ ڈرائنگ روم یا لونگ روم میں ہی دور دور بیٹھے رہتے اور ہلکی ہلکی موسیقی کے پس منظر میں سرگوشیاں یا چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ کچھ دو ڈانس فلور پر ڈانس کرنے لگتے آنٹی سب کے خاطر تواضع میں لگی رہتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے ہر ایک گروہ یا جوڑے کے پاس جاکر پوچھنے لگتیں۔
"ڈیو وانٹ انی تھنگ ڈارلنگ"

ہر طرح کی اعلیٰ شراب کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے لوازمات اور لذیذ غذائیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ اور جس کو جس وقت جہاں کھانے کی ضرورت ہوتی وہاں

منگوالیتا۔

کبھی کوئی جوڑا کچھ دیر کے لئے ڈرائیو پر چلا جاتا۔ کوئی دو ایک گھنٹے گزار کر آن اپنی گھر والی کے ڈر سے جلدی چلا جاتا۔ کوئی نصف شب کو، کوئی اس سے بھی دیر سے، کوئی صبح سویرے۔ اور کوئی گاہک تو ناشتہ سے بھی فارغ ہو کر جاتا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جانے والا جاتے جاتے آنٹی کو سویرے کے مطابق سو سو کے بہت سے نوٹ یا ہزار کے ایک دو نوٹ دے جاتا۔ اس کے بعد آنٹی اپنا بڑا سا حصہ کاٹ کر باقی مقررہ رقم کمانے والی کو دے دیتیں۔ یہ ایک بندھا ہوا معمول تھا۔ تمام عورتیں اور آنٹی ایک طرف، اور تمام گاہکوں اور آنٹی میں دوسری طرف ایک ایسی ایک فہمی ہوتی تھی کہ کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا۔

آنٹی کا دائرہ اثر و رسوخ جس قدر لامحدود تھا، ان کی رسد بھی اسی طرح بے انتہا تھی۔ کسی دوسری تجارت کی طرح یہاں بھی نیا نیا مال آتا رہتا تھا۔ کھپتا رہتا تھا، اور جب ٹھکانے لگ جاتا تو اور نیا مال سجا کر آنٹی بیٹھ جاتی تھیں۔

آنٹی کئی طریقوں سے اپنا مال دستیاب کرتی تھیں۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ متوسط طبقے میں کاروبار کرنے والے دلالوں سے ان کا ربط تھا یہ دلال ایسی دوشیزاؤں کو آنٹی سے ملا دیتے تھے جو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں۔ ان میں کالج کی لڑکیاں بھی تھیں۔ دفتروں میں کام کرنے والیاں بھی اور گھریلو بیویاں بھی جو شوہروں کی مرضی سے یا شوہروں کی لاعلمی میں "زر نگار" آجایا کرتی تھیں۔ خالص اور اعلانیہ پیشہ ور عورتوں کو ان کے نمایاں گھٹیا پن کی وجہ سے آنٹی نہیں لیتی تھیں۔ سوائے ایسی لڑکیوں کے جو بے حد قبول صورت یا غیر معمولی جنسی کشش رکھنے والی ہوتی تھیں۔ ایسی لڑکی کی وہ خفیہ طور پر کئی روز تک تربیت کرتیں کہ کس طرح چلنا چاہئے۔ کس طرح اٹھنا اور بیٹھنا چاہئے۔ مسکرانے کے انداز اور بات چیت کے طور طریقے کیا ہوں اور اس میں جو بھی خامیاں ہوں وہ دور کر دیتیں۔

مثلاً دورانِ گفتگو میں چھت کی طرف دیکھنا۔ سر کھجانا، منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں سے کچھ نکالنا۔ ڈکار لینا وغیرہ آنٹی بڑی خوش اسلوبی سے یہ عیب نکال دیتیں۔ پھر اس کو ایسے لباس اور زیور مہیا کر دیتیں۔ جو دیکھنے میں بڑے قیمتی لگتے تھے۔ لیکن در اصل اتنے قیمتی نہ ہوتے تھے۔ رنگوں کے امتزاج، مختلف اوقات میں رنگوں کا استعمال، اور سنگھار کے اصول اور معیار اچھی طرح سمجھا دیتیں، اور ان چیزوں کا ذوق اس میں " کاشت" کرتیں جب آنٹی کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی گاہک کو اس مال سے کوئی شکایت ہی پیدا نہیں ہو سکتی تب وہ اس کی نمائش کرتیں اور بڑے دل لبھانے والے انداز میں اس کو پیش کرتیں اور مال یکایک چل پڑتا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی جو اونچے طبقے کے کئی گھرانوں اور خاندانوں میں رسوخ رکھتی تھیں، اسکینڈلز پر ہمیشہ کان لگائے رہتی تھیں۔ جہاں انھیں پتہ چلا کہ کسی بیوی کی اپنے شوہر سے ان بن رہتی ہے یا کسی نے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یا طلاق لے لی ہے تو اس کو بڑی ترکیب سے اپنے دام میں لے آتیں پھر شوروم میں منتقل کر دیتیں۔ جہاں اس نئی درآمد کو خوش آمدید کہا جاتا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی سماجی محفلوں اور تقریبوں میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھتیں جو ان کے نزدیک اس پیشے میں بڑا خوش گوار مستقبل رکھتی تھیں۔ آنٹی کی یہ ٹوہ پہلے تو ان کی عادت بن گئی پھر جبلت، جو غیر شادی شدہ عورت، یا نوخیز بلا ان کو بڑی ایڈوانس، فیشن زدہ، سوشل حلقوں میں گھل مل جانے کی دلدادہ، بے تکلف، بے حجاب شوقین اور رنگین مزاج نظر آتی وہ اس پر ذہنی طور سے نشان لگا دیتیں۔ فوراً اس کی گرویدہ ہو جاتیں۔ بڑی جلدی اسے بھی اپنا گرویدہ کر لیتیں اور اس کے بہت سے گرویدہ ہونے والے اسے مہیا کر دیتیں۔

چوتھا طریقہ یہ تھا کہ، امریکہ، یورپی ممالک اور مشرق وسطیٰ کے علاوہ ہانگ کانگ

ٹوکیو، اور سنگاپور کے اعلیٰ معیاری قحبہ خانوں اور پیشہ ور عورتوں کے تاجروں سے ان کا ربط تھا، وہ اپنے اور ان کے ذخیروں کے نوادرات کا تبادلہ کیا کرتی تھیں۔ وساور سے آئے ہوئے بیش بہا نمونوں کو وہ تاج، ایمبیسڈر، اسن این سینڈز، نٹ راج، اور رٹز سے کم درجے کے ہوٹلوں میں نہ رکھتی تھیں اور ان کے فرضی خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی تشہیر کر کے اونچے شوقین حلقوں میں ان کے لئے طلب پیدا کرتی تھیں۔

یہ چار عام اور مستقل طریقے تھے، ان کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی آنٹی مال حاصل کرتی تھیں یا مال ان تک پہنچ جاتا تھا، حسن و جمال کے یہ نوادرات خرچ کرنے والوں کی حیثیت کے مطابق ہمیشہ دستیاب ہو سکتے تھے۔

"زرنگار" محض اعلیٰ پیمانے کی ہوس کاری کا مرکز ہی نہیں تھا، جہاں کتنی ہی کنواریوں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کیا تھا اور کئی دوسری عورتوں نے دنیا کا سب سے پرانا اور آسان پیشہ شروع کیا تھا، بلکہ بڑے بڑے تاجروں اور سرکاری عہدیداروں کی کارگزاریوں کی ابتدا اور انتہا بھی یہاں ہوا کرتی تھی اور آنٹی کو کمیشن کے طور پر بڑی بڑی رقمیں اور تحفے تحائف ملا کرتے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ٹھیکے، درآمد و برآمد کے اجازت نامے، بڑی بڑی رکی ہوئی کارروائیوں کی تجدید، یا رواں دواں کارروائیوں کی رکاوٹ، عظیم و فلک بوس عمارتوں، بے نظیر تھیٹروں، نئی فیکٹریوں، ملوں اور فیکٹریوں کے قیام کے منصوبے یہاں بنتے تھے اور مشکلوں میں گرفتار بڑے بڑے سرمایہ داروں کی نجات کا یہاں انتظام ہوا کرتا تھا۔ بعض دفعہ سیاسی اور صنعتی پالیسی غیر سرکاری طور پر یہاں طے پاتی تھی جو بعد میں سرکاری نوعیت اختیار کر لیتی تھی، ایک دفعہ تو ایک سیاسی جماعت کے مینی فسٹو کا خاکہ یہاں تیار کیا گیا تھا۔

"آنٹی کا مقولہ تھا" دنیا کا کوئی کام امپاسبل نہیں، عورت اور شراب سپلائی کر کے دیکھ لو"، عورت اور شراب سپلائی کر کے انھوں نے نہ صرف دوسروں کے کام بنوائے تھے، بلکہ اپنے کام بھی نکالے تھے۔ ان عورتوں کا کام بھی بن گیا تھا جو سپلائی کی گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی جگہ

خوش تھے۔

آنٹی کی خدمات بڑی مخلصانہ، باذوق، انتہائی آرام دہ، بے خطر، اور اپنی تجارت میں اتنے اونچے معیار کی تھیں کہ کوئی ان سے مسابقت ہی نہ کر سکتا تھا اور اس اجارہ داری میں ان کا کاروبار چمک چمک اٹھا۔

آنٹی سے میرا ملنا جلنا بہت بڑھ چکا تھا۔ آنٹی کی شفقت اور نوازشیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اگر کسی وجہ سے چار پانچ روز تک ملنا نہ ہوتا تو ہم بے چین ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈھ نکالتے۔ اپنے مسائل، اپنا دکھ درد ایک دوسرے کو سناتے، مشورے لیتے اور دیتے، دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے، میں ان کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا اور وہ بھی شاید مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، جبھی تو ایک روز اچانک پوچھ بیٹھیں۔

"یہ بتاؤ ڈارلنگ! تم کو میرا آکیوپیشن پسند نہیں، تم کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں، دل والی ڈو یو لائک ٹو کم ہیر اینڈ سی می؟"

"آپ میرے لئے بہت اچھی ہیں، بس یہی میرے لئے بہت کافی ہے۔" میں نے بیساختہ جواب دیا۔

"یو آر ٹو آنسٹ۔" آنٹی جذباتی ہونے لگیں۔ "آئی لائک یو وری مچ۔ آئی یو ٹو ڈیزی چاہتا ہے تم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ تمھاری ایک ایک چیز کی کیر کروں۔ تم کو ہر ایک کمفرٹ پہنچاؤں میں تم سے اتنی کلوز ہو گئی ہوں کہ کسی اور سے نہیں۔ آئی ڈونٹ نو وائی؟ یا شاید بی کاز سم ٹائمز آئی بیلیو دیٹ یو آر مائی سن۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ کہیں کھو گئیں۔ میں چپ چاپ وہسکی کے گھونٹ اتارتا رہا۔ بڑی دیر تک ہم یونہی بیٹھے رہے یکایک آنٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں

"ڈیم می۔" رو رو کر کہتی جاتی تھیں۔ "آئی ایم اے سوائن ڈارلنگ۔ آئی ایم اے بچ آئی ایم اے ہور، آئی ایم رچڈ، ڈارلنگ میں بہت بری عورت ہوں۔"

آنٹی جو ہر وقت مسکراہٹوں اور مسرتوں سے لدی رہتی تھیں، اور ہمیشہ مسکراہٹوں اور مسرتوں کی ہی تجارت کرتی تھیں وہ آنسوؤں کی چوری چوری ساخت بھی کرتی تھیں۔ میں انھیں ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اب تک کوئی بے گناہ تھیں۔ اور حیرت خیز طور پر انھوں نے اچانک ایک اعتراف جرم کیا ہے۔ جس پر مجھے یقین نہیں آتا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آنسوؤں سے آپ کا کیا واسطہ۔ لیکن پوچھا نہ گیا۔ اس قدر خوش حال اور خوش مزاج عورت کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا کہ اسے بھی کوئی دکھ ہوگا۔ اس کی روح بھی مجروح ہوگی، بظاہر ہم جن کو دائمی طور پر مسرور سمجھتے ہیں وہ بھی در اصل دائمی طور پر مغموم ہی ہوتے ہیں ان کا ملمع ہم کو ان کی اصلی تہہ تک پہنچنے ہی نہیں دیتا مگر اس ملمع کا جھلکا ایک دفعہ یوں نکل آتا ہے جیسے ہیراکی کے پیراہن میں نیم عریاں تنومند عورت کو دیکھ کر نظر اس کا برائے نام لباس فوراً اتار دیتی ہے۔

انھی "سوائن" اور "رچڈ" آنٹی نے مجھے ایک روز ٹیلیفون کیا۔ اس سال بمبئی میں بڑے زور کی برسات ہو رہی تھی اور ایک تسلسل ایسا تھا کہ کئی روز سے بمبئی مفلوج پڑی تھی اور زندگی معطل سی، کتابیں اور رسالے پڑھ پڑھ کر، ریڈیو سن سن کر اور خوب سو سو کر میں بری طرح اکتا گیا تھا۔ بس ایسے ہی موقعوں پر کنوارپن سے سخت نفرت ہونے لگتی ہے اور کسی سے بھی شادی کرنے کو جی تڑپنے لگتا ہے۔ ایک دھواں دھار اور تنہائی گزیدہ شام کو چائے پیتے ہوئے میں مختلف لڑکیوں کو تصور ہی تصور میں شادی کی پیش کش کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ڈارلنگ ـــــ کسی طرح چلے آؤ ـــــ امیڈ ٹیلی ـــــ ارجنٹ کام ہے۔"

"آنٹی آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر راستے میں پانی بھرا پڑا ہے۔ تین چار روز سے کار یونہی کھڑی ہے۔ پتہ نہیں بیٹری کام بھی کر رہی ہے یا نہیں۔"

"میں اپنی کار بھیج دیتی ہوں۔"

جب آنٹی کے ہاں پہنچا تو ایک لڑکی ان کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے ایک نظر دیکھ کر اپنی بڑی بڑی پلکوں کے غلاف اس نے اپنی غزالی آنکھوں پر ڈال دیئے۔

"ڈارلنگ، ان سے ملو، مس پاربتی مصرا۔" پھر آنٹی نے اس کو میرا نام بتایا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پھر جواب میں نمستے کی۔

"ڈارلنگ تم ان سے شادی کر لو۔"

بادل بڑے زور سے گرجے اور بجلی کوند گئی۔

"میں کل ہی رجسٹرار کو انفارم کر دوں گی۔" آنٹی مسلسل برس رہی تھیں۔

"پہلے میں ماں باپ کو خط لکھ کر اجازت تو لے لوں۔" میں نے مورچہ سنبھالا۔

"آخر وہ بھی تو شریک ہوں گے شادی میں۔"

"ڈیم اِٹ — یہ ہندوستانی ماں باپ بھی پیکولر چیز ہیں — میرج ہو گی اولاد کی اور سلیکشن ہو گی ان کی۔ میں کہتی ہوں ڈارلنگ تم اپنی مرضی کی شادی میری سلیکشن سے کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں اور پاربتی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بات یہ ہے آنٹی آپ میرے گھر کی پیکولر حالت اور مجبوریاں نہیں جانتیں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔" آنٹی نے بات کاٹ کر کہا "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اس لیڈی سے شادی کر لو۔ شی از سو سویٹ اینڈ چارمنگ اینڈ کیوٹ۔" وہ پاربتی کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ان ہی کی اپنی تخلیق تھی۔ "پور پاربتی۔" پھر میری طرف رخ کیا۔ "بے چاری بڑی بدنصیب ہے۔ یو ول سمپلی کرائی اباؤٹ ہر مس فارچون، بڑی اچھی فیملی کی ہے۔ گریجوٹ ہے، کلچرڈ ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ سے ایلوپ کر کے آ گئی۔ اور یہاں آ کے اس باسٹرڈ نے اسے بی ٹرے کر دیا۔ کہنے لگا شادی کی بس ایک کنڈیشن ہے کہ فلموں میں کام کرو، پور پاربتی کو ایگری کرنا پڑا۔ پھنس جو گئی تھی پھر کیا ہوا یو نو؟ آل دوز ڈرٹی پروڈیوسرز۔ اور اسسٹنٹنگ ڈائرکٹرز فلرڈ ود ہر۔ پھر وہ

بھی دُعا دے گئے۔ کوئی کہنے لگا چن نکیلی ہے۔ کوئی بولا دائیس مردانہ ہے۔ کسی کی ادبی بن تھی کہ ان فوٹو جنک ہے۔ اینڈ سو آن ــــ اینڈ سو فورتھ، اور پتہ ہے اس کے سن آف اے گن بولے فرینڈ نے کیا کہا؟ یہاں تک آتے آتے آنٹی کے لہجے میں غضب ناک اتار چڑھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں وہ ایک ثانئے کے لئے رکیں۔ میری نظر فطری طور پر پاربتی پر گئی۔ اور اسی وقت اس کی نظر جو مجھ پر تھی جھک گئی۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ زرد ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کو ہراسانی سے بچانے کے خاطر آنٹی کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں "ہی آسکڈ ہر ٹو ڈو پروسٹی ٹیوشن"! آنٹی کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اس سکوت کی چٹان تلے تین ذہنوں کی ہل چل تھی۔

"دیٹ از وائی شی از ہیر۔ لیکن یہ بچاری اس پروفیشن سے سخت نفرت کرتی ہے، تمھاری طرح۔ اینڈ شی ٹولڈ می کہ کوئی بھی شریف آدمی اس سے شادی کر لے تو شی از ریڈی۔ میں نے سوچا تم سے اچھا پاربتی کو کون ہسبینڈ مل سکتا ہے۔ ڈارلنگ پلیز تھنک اوور اِٹ"

میری فکر و فہم خلاؤں سے بھرپور ہو گئی۔ اس طرح مجھے خاموش دیکھ کر آنٹی کو حیرت سی ہو رہی تھی۔ انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ میں ان کے حکم سے انکار نہیں کروں گا۔ پاربتی معمولی طور پر مایوس دکھائی دیتی تھی گویا اسے یقین تھا کہ بس اس پیش کش کو قبول نہ کروں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ؟" آنٹی نے پوچھنے کے انداز میں جیسے کہہ دیا کہ آخر اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے، ہاں کر دو ورنہ اس سے اچھی لڑکی پھر نہ ملے گی۔

لڑکی بہت اچھی تھی اس میں تو کوئی شک نہیں تھا، لیکن در اصل میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ میرے آمد و خرچ کے موازنے میں اور ذمہ داریوں کی فہرست میں ابھی اس کی بالکل گنجائش نہ تھی دوسرے اس لئے کہ جس ڈھب سے میری زندگی گزر رہی تھی میں اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ایسے

ماضی رکھنے والی لڑکی کو میں بیوی بنانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔

" آئی ایم سوساری آنٹی ۔ آئی کانٹ "

آنٹی کو بڑی سخت مایوسی ہوئی ۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے پاربتی کو دیکھا اور اندر چلی گئیں ۔ پاربتی کے آنسو نکل پڑے ۔ مجھے بڑا افسوس ہوا مگر میں مجبور تھا ۔ کچھ دیر بعد آنٹی ایک سفید لفافہ لئے آگئیں اور پاربتی کے حوالے کرتی ہوئی بولیں ۔

تمھارا ایک دیک کا خرچ "

" نو تھینکس آنٹی " پاربتی نے بڑی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ۔

آنٹی نے بہت اصرار کیا لیکن اس کے انکار کو اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی ۔

" ڈونٹ آپ ہوپ " جب وہ جانے لگی تو آنٹی نے اس سے کہا ، مجھ سے ملتی رہنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا "

" پرویسٹی ٹیوشن کے لئے میرے پاس سینکڑوں لڑکیاں آئیں " اس کے جانے کے بعد آنٹی مجھ سے بولیں " اونلی دس ون ، اس کے لئے اگر کبھی یہ نہیں کرنا چاہتی ۔ سوا پیرینج

دوسرے دن شام کو آنٹی نے پھر فون کیا ۔

" ہلو ڈارلنگ ، یو نو ، پاربتی نے سوسائیڈ کرلی ۔ ایوننگ نیوز میں خبر آئی ہے ۔ آئی ڈونٹ نو کیسے لوگ اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں ۔ مرنے کو کیسے تیار ہو جاتے ہیں ۔ جسٹ ایجن ! وہ پاربتی جس کے ساتھ کل شام کو تم میرے پاس بیٹھے تھے ، اس نے آج خود اپنی جان لے لی ، کانٹ بلیو ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا مسٹری ہے ۔ سفرنگ اور ڈیتھ کیوں ہوتی ہے اور کہاں سے آتی ہے ۔ ڈارلنگ اگر دنیا سے یہ ختم ہو جائیں تو دنیا کتنی بیوٹی فل اور کلرفل بن جائے ۔ کیا خیال ہے تمھارا ؟ "

" آنٹی ہر ایک کی زندگی اور موت اس کا تجربہ ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہو ہی نہیں سکتا "

" پاربتی کی جگہ میں ہوتی تو کبھی سوسائیڈ نہیں کرتی " آنٹی نے میری بات کاٹی اور فون رکھ دیا ۔

قہقہوں کے ایک شور سے میں چونکا، مہمانوں کا آخری گروہ رخصت ہو رہا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے، آنٹی اور ان کے ماضی کے بارے میں سوچتے سوچتے میں ذہنی طور پر ایسا گم ہو گیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کب ان کی سالگرہ کی دعوت ختم ہوئی۔ آنٹی میرے پاس آئیں۔

"کم ان مائی روم ڈارلنگ۔"

ہم دونوں ان کے کمرے میں پہنچے۔ مجھے انھوں نے ایک صوفے پر بیٹھا دیا اور خود میرے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیر تک دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے جو جذبات جھلک رہے تھے میں ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اپنے آپ کو گویا میری گمشدہ ماں محسوس کر رہی تھیں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آنٹی جو کبھی کبھی پچاس سے زیادہ کی زندگی پر خوف زدہ ہو جاتی تھیں اب پچاس ہزار برس جینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹیں گی۔

"ایٹ پریزنٹ تم ایک ہی آدمی ہو جسے میں اپنا سمجھتی ہوں۔ بائی ناؤ تم میرے بارے میں کافی جانتے ہو لیکن بہت زیادہ نہیں۔"

"آنٹی اگر آپ اپنے بچپن اور جوانی کے بارے میں۔۔۔"

"رائٹروں کی ذات بڑی ان کوئی زیٹو ہوتی ہے۔" آنٹی نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے پتہ تھا تم ایک نہ ایک روز ضرور پوچھو گے۔ خیر تمھاری کیوریاسٹی کے لیے میں بہت ہی شارٹ کر کے بتاؤں گی بی کاز یو آر وری ڈیر ٹو می۔ آئی ایم پراؤڈ ٹو ہیو این ان سلفش فرینڈ لائک یو۔"

"تھینک یو آنٹی۔" میں نے اپنی تعریف سے خوش ہو کر کہا۔

"ویلکم۔ یہ اور بات ہے کہ تمھارے اور میرے آئیڈیاز کبھی نہیں ملے۔ بٹ آئی ڈونٹ کیئر۔" آنٹی نے دو پیگ بنائے ایک میرے سامنے رکھا۔ ایک سگریٹ مجھے دیا اور ایک خود جلایا گہرے کش کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگیں "کسی اور کو میرا پاسٹ کچھ معلوم نہیں۔

میں گلبرگہ ڈسٹرکٹ کے ایک فار آف ولیج میں آج سے پورے ففٹی ایئرز بیک پیدا ہوئی تھی۔ آئی واز
بارن اے مسلم۔ آفٹر برتھ میرے کانوں میں اذان دی گئی اور اذان دینا میرے فادر کا آکیوپیشن
تھا۔ میں بڑی منتوں مرادوں اور آل سارٹس آف نان سنس کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اسی
روز شام کو مائی مدر ڈائیڈ۔ دن آئی واز براٹ اپ بائی اے اسٹیپ مدر، جب سے ہوش سنبھالا
ظلم اور ٹارچر ہی کی گود میں اپنے آپ کو پایا۔ چار پانچ سال کی تھی کہ فادر آلسو پاسڈ اوے۔
پھر ایک جاگیر دار نے مجھے خرید لیا وہاں بھی دن رات بیٹنگ ملتی تھی۔ بیٹ بلڈی جاگیر دار، ہز لو
وائیف چلڈرن اور سرونٹس جلتے پھرتے جس کا جی چاہتا ہاتھ صاف کرتا رہتا۔ سڑے ہوئے کھانے،
ڈرٹی کلوتھز۔ پتہ نہیں میں کیسے جی اور کیوں جی گئی۔ اوہو۔ ڈیم اٹ میں بے کار ڈٹیلس
میں جا رہی ہوں"۔

" ایسے ہی سنائیے آنٹی" میں نے مچل کر کہا"۔

" نو نو نیور" آنٹی نے اس کانچ کا گھونٹ لیا۔ "خواہ مخواہ آئی ایم گٹنگ اموشنل فار ویٹ
ہارڈ پاسٹ، فل آف سفرنگ۔ جب میں جوان ہوئی تو میری میچ لیس بیوٹی میرے لئے بلا بن
گئی۔ اس کے لئے میں نے بہت دکھ جھیلے۔ بڑی سخت اور منحوس بیماریوں سے بچ نکلی۔ ا
کسی کے ساتھ بھاگ گئی، کسی کی وائف بنی، محبت بھی کی، رومانس بھی کیا، پروسٹی ٹیوشن
بھی کیا، گندے سے گندے اور گھٹیا سے گھٹیا مردوں کے پاس رہی جس میں اسمگلرز، ایک
پاکٹس، موالیز اور پمپس بھی تھے۔ اچھے سے اچھے مردوں کے ساتھ بھی رہی جن میں
جنادری انٹلکچولز، آرٹسٹ کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی، عیاشی کے ایک سے ایک بڑھ کر خلیفہ
کو انٹرٹین کیا۔ بہت رتج مل اونرز گورنمنٹ آفیسرز اور نہ جانے کس کس کے بستر گرم کئے۔
سولہ بیٹ گرائے، دو دفعہ ووم میں ٹیومر ہوا، آپریشن کروائے اس بار اگر ہوگا تو کینسر
ہی ہوگا"۔

وہسکی کا ایک اور گھونٹ، سگریٹ کا ایک اور کش لے کر آنٹی نے سلسلہ بیان جاری رکھا،

"ون فائن مارننگ اٹ ڈانڈ ایان حی کہ دنیا والوں سے جوتے کھا کر جینے سے پچ بیٹر ہے کہ دنیا کو جوتے مار کے جیا جائے، ون آئی مٹ وتھ تھرٹی منڈس سکسس، میری لائف جو ایک ویران ڈزرٹ تھی، میں نے اس میں ایک نہایت ہی پرفریب اور خوبصورت سراب کری ایٹ کیا اور یہ باسٹرڈ مرد دوڑ پڑے۔ ناؤ آئی ہیو گاٹ اوری تھنگ، لاٹ آف مانیٹری سکیورٹی، اینڈ سوشل اسٹیٹس"۔

پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں"۔

"بس ایک ڈر ہے، اگر یہ سب کچھ چھن گیا تو کیا ہوگا۔ اس عمر میں کہاں جاؤں گی، کیا کروں گی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے۔ یہ سفرنگ کس طرح ہوگی۔ اسی لئے تو میں لنگرنگ لائف اسٹرگلنگ فار اکزسٹنس اور ڈی لیڈ ڈیتھ سے ڈرتی ہوں۔

"مگر یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں آنٹی"۔

"یو آر ٹو فیٹلسٹ۔ پھر وہی ڈفرنس آف اوپی نینس کی بات آ گئی"۔

"تو پھر بتائیے سفرنگ اور ڈی لیڈ ڈیتھ کا خود آپ کے خیال میں کیا علاج ہے"۔

آنٹی نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور طنز سے مسکرائیں جیسے وہ کوئی بہت ہی پختہ کار تھیں اور میں ان کے مقابلے میں بڑا ہی نادان تھا۔

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ——— زہر کا علاج زہر سے ہی ہو سکتا ہے"۔ آنٹی نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا"۔

ان کے اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

"اوکے۔ گڈ نائٹ مائی بوائے"۔ آنٹی کھڑی ہوتے لگیں۔

"مگر آنٹی.....،

آئی ایم ٹو ٹائرڈ ناؤ۔ سلیپنگ پلز کھا کر سو رہوں گی"۔

میں جانے کے لئے اُٹھا اور ان سے ہاتھ ملایا"۔

"گڈ بائی" اور آنٹی نے میرے گال چومے۔

راستہ بھر میں ان کی نامکمل اور غیر تشفی بخش گفتگو سے جھنجھلاتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لباس تبدیل کر کے اور روشنی بجھا کر بڑی دیر تک بستر پر پڑے پڑے سوچتا رہا نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

صبح کوئی نو بجے ٹیلیفون نے شور مچا کر مجھے جگایا۔

خبر ملی کہ آنٹی نے رات کو بہت سی خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔

رام لعل

آخری خواہش

میں نے اپنی بیوی سے سلوجا کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "کے! یہ میرا بہت ہی پیارا دوست ہے۔ بچپن کا!"

میں اپنی بیوی کو پیار سے "کے" کہہ کر پکارتا ہوں۔ ویسے اس کا اصلی نام کانتا ہے۔ کے نے میرے دوست کا سواگت دونوں ہاتھ جوڑ کر اور ایک بہت ہی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ یہ مسکراہٹ کے کی دل کش شخصیت کا خاص حصّہ ہے۔ اُس نے جلدی سے نوکر بلا کر ٹیکسی میں سے سلوجا کا سامان نکال لانے کے لئے کہا اور خود ڈرائنگ روم سے ملے ہوئے گیسٹ روم کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ "میں ابھی آئی جی! ان کے لئے ذرا ایک نظر کمرے کو دیکھ لوں!"

سلوجا کے کی شخصیت اور خصوصی توجہ سے متاثر ہو کر بولا۔ "بھابی، مجھے یہاں ٹھہرنا تھوڑی ہے۔ ! پلیز ڈونٹ بادر ! میں شام کی گاڑی سے کلکتہ چلا جاؤں گا۔"

کے دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ پلٹ کر اس صوفے کی پشت کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی جس پر اسی لمحہ سلوجا نے خود کو گرایا تھا۔ بولی "جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے! کچھ روز رہئیے! اپنے بچپن کے دوست سے اتنے عرصہ کے بعد مل کر خوشی نہیں ہوئی آپ کو؟ یہ تو آپ کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں!"

میری بیوی کی زبان سے کبھی کبھی اتنی پر لطف اور سچی بات نکل جاتی ہے

جو مجھے بہت متحرک کر دیتی ہے ۔ میں نے سلوجا کی اور پہلے تو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر اس کے پاس صوفے میں دھنس کر اُس سے پلٹتے ہوئے کہا ۔ "سنا تم نے ؟ تمہاری بھابی نے کیا کہا ہے ؟ اتنی جلدی جانے کی اجازت نہیں ملے گی تمہیں !"

سلوجا بولا ۔ "لیکن کل تک مجھے [illegible] پہنچنا ہے ۔ کل وہاں ٹینڈر کھلیں گے ۔ نہیں پہونچوں گا تو میری فرم مجھے سروس سے فوراً الگ کر دے گی ۔ جانتے تو ہو پرائیویٹ فرموں کا ایٹی ٹیوٹ ۔ ! تمہاری طرح گورنمنٹ کا گزیٹڈ افسر تھوڑے ہی ہوں ! ایک ڈپٹی جیلر کو کسی ٹینڈر کی اہمیت کا احساس کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"دیکھو سلوجا ! زیادہ بک بک کی یہاں تو اُٹھا کر جیل میں بند کر دوں گا !"

ہم تینوں زور سے ہنس دیئے ۔ کے تو دیر تک ہنستی ہی چلی گئی ۔ پھر اچانک ابھی ہنسی روک کر سلوجا سے بولی ۔ "آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجیے ۔ میں تب تک ناشتہ لگاتی ہوں !"

"ہاں بھئی اس وقت تو فوراً ہی کچھ کھانے کو جی مچل رہا ہے ۔ راستے میں کہیں چائے بھی نہیں مل سکی !" یہ کہہ کر سلوجا اپنے سامان کی طرف جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔

میں نے بیوی کو بتایا ۔ "کے دیکھا ! ہم دونوں کی عادتیں کتنی ملتی ہیں ! بھوک، پیاس مذاق، غصہ ! ہر معاملے میں ہم ایک ہی جیسے واقع ہوئے ہیں، جب ہم کالج میں تھے تو ہماری ذہانت کا معیار بھی ایک ہی جیسا تھا ۔ ہم ایک ہی قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے ۔ فلموں اور آرٹسٹوں کے بارے میں بھی ہمارا ٹیسٹ کامن تھا اور ہمارا دوستوں کا سلیکشن بھی قریب قریب ایک ہی قسم کا ہوتا تھا ۔ کسی کسی آدمی سے چڑ رکھنے تک میں بھی ہم پارٹنر ہی ہوتے تھے ! کیوں سلوجا ؟"

میں نے ہنس کر اس سے اپنی باتوں کی تائید چاہی اور کے کو مزید بتایا ۔
"یہی سب دیکھ کر ہمارے فرینڈ اور ٹیچر کہا کرتے تھے ۔ تم لوگ جڑواں کیوں نہ پیدا ہو گئے !

شاید شکل بھی ایک سی ہی پائی ہوتی!"

کمے نے بڑی میٹھی نظر سے سلوجا کی طرف دیکھا۔ غالبًا وہ اس کی دل کشی اور صحت سے میرے ساتھ موازنہ کرنا چاہتی تھی کہ سلوجا کاندھے پر تولیہ ڈال کر باتھ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا۔ میری بیوی سے کہنے لگا۔" بھابی، کمار نے اپنی اور میری اور تو سب باتیں آپ کو بتا دیں لیکن ایک بات شاید کبھی نہیں بتائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھوں میں بڑی شرارت بھر کر میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ میں ہی بتا دوں وہ بات!

" اب کون سی بات رہ گئی ہے سالے" ! میں نے اپنی بیوی کے سامنے اُسے بڑے پیار سے گالی دے دی۔" بتا دے نا وہ بات بھی! میں ڈرتا تھوڑی ہوں!"

کانتا ہم دونوں کی دلچسپ گفتگو کی وجہ سے وہاں سے ہٹ نہیں پا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں سلوجا پر ہی جمی تھیں۔ کہ وہ آخر کہتا کیا ہے! سلوجا نے مجھے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے دیکھ کر کہا۔" لا، ایک سگریٹ پلاؤ پہلے۔!"

سگریٹ سلگا کر بولا۔" بھابی، عشق میں بھی ہماری پسند ایک ہی نکلی تھی! یعنی ہم دونوں ایک ہی لڑکی سے عشق کیا کرتے تھے! یاد ہے نا کمار!"

میں اچانک سناٹے میں آگیا۔ اپنی بیوی کی طرف ایک ٹک دیکھتا سا رہ گیا۔ یک بیک گھبرایا ہوا سا! مجرموں کی طرح! کانتا بھی میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں جھک بھی اُٹھی تھیں۔ لیکن اس کی نظر مجھے ٹٹولتی ہوئی سی لگی۔ دل کی گہرائی تک اترتی ہو

سلوجا نے ایک بھولی بسری یاد دلا کر مجھے ایک صدمے سے دو چار کر دیا۔ میں بڑی کوشش سے مسکرایا۔ اور کانتا کے قریب جا کر اُس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے بہت ہی آہستگی سے اور کہا۔" اُسے میں بچپن کی حماقت تو نہیں کہوں گا کیونکہ میں اس وقت اٹھارہ اُنیس برس کا ہو ہی چکا تھا۔ اور جس لڑکی سے محبت کی تھی وہ اب اس د

ہیں موجود بھی نہیں ہے۔ وہ اُسی زمانے میں مرگئی تھی۔ لیکن میں تمہیں وشواس دلا سکتا ہوں کہ میں نے اس کی نسبت تمہیں کہیں زیادہ چاہا ہے۔"

اس پر کانتا زور سے ایک مترنم قہقہہ مار کر بولی ۔" آپ اتنے اموشنل کیوں ہوئے جا رہے ہیں ؟ اگر آپ نے مجھ سے ملنے سے پہلے کسی اور سے بھی محبت کی تھی تو میں اس کے لئے آپ کو ملزم تھوڑی سمجھتی ہوں !" ۔

سلوجا ہم دونوں کے پاس آکر بولا ۔" بھابی' میں نے ایک بار جب اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ روشنی تم سے نہیں مجھ سے محبت کرتی ہے تو غصے میں بھر کر اس نے میرے منہ پر گھونسہ دے مارا تھا ! اچانک حملے سے میرا سارا جبڑا ہی ہل گیا تھا اور دانتوں سے خون آنے لگا تھا ۔ کیوں کمار !"

گھونسہ مارنے کی بات یاد آتے ہی میں زور سے ہنس پڑا ۔ سلوجا سے کہا ۔ " اب جلدی سے باتھ روم جاؤ ورنہ اُسی قسم کا گھونسہ اور دے ماروں گا ! تمہارے ساتھ ناشتہ کر کے مجھے آفس بھی جانا ہے ۔"

ناشتے کی میز پر کانتا نے بہت سی لذیذ چیزیں لگا دی تھیں' لیکن میں ان سے بھی زیادہ اچھی ایک چیز اسے دکھانے کے لئے' اپنے پرانے کاغذات میں سے نکال لایا اسی لڑکی کا فوٹو ۔ جسے سلوجا نے تو بس سرسری نظر سے ہی دیکھا لیکن کانتا اُسے ہاتھ میں لئے بیٹھی سی رہ گئی ۔ اُسے عجیب تیکھی نظروں سے دیکھتی رہی ۔

میں نے اس سے کہا ۔" کے' یہ بھی ایک حقیقت سمجھو .... کہ یہ لڑکی مر نہ گئی ہوتی تو آج تمہاری جگہ پر یقیناً وہی بیٹھی ہوتی !"

سلوجا آملیٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کانٹے میں لگا کر منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گیا ۔ بولا ۔" یہ منہ اور مسور کی دال ! وہ زندہ ہوتی تو میں ابھی تک کنوارا تھوڑے ہی رہ گیا ہوتا ! اُس نے مجھ سے ہی شادی کی ہوتی جناب !"

میں نے ہاتھ میں اُٹھائی ہوئی چھبی اس کے سامنے کر دی۔ اور کہا۔" یہ تمہاری خوش فہمی ہے محض! مجھے چھوڑ کر وہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی تھی!"

کانتا نے ہم دونوں کو ہنستے ہنستے بڑے پیار سے ڈانٹ پلائی۔" افوہ! آپ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں! ایک ایسی لڑکی کے لئے جھگڑنے لگے جو اب زندہ ہے ہی نہیں!"

اس نے پھر میری طرف رخ گھما کر مجھ سے جواب طلب کیا۔" بتائیے، آپ نے اب تک یہ فوٹو چھپا کر کیوں رکھی ہوئی تھی؟ کیا مجھ سے چھپ چھپ کر اس سے اپنا من بہلاتے ہیں؟"

میں نے کہا۔" ارے نہیں کے۔ اسے تو میں بالکل بھول ہی چکا تھا۔ اس سلوچا کمبخت نے آج اس کی یاد دلا دی تو میں تلاش کر کے اسے نکال لایا۔ تمہیں دکھانے کے لئے ہی۔ چاہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دو!"

سلوچا بولا۔" اسے پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے بھابی۔ یہ تصویر مجھے دے دیجئے۔ اس پر تو میرا حق زیادہ ہے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اسی کی یاد کے سہارے زندگی گذار رہا ہوں۔ کمار کو تو آپ جیسی چارمنگ درلف مل ہی چکی ہے!"

یہ کہہ کر اس نے کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔ اُسے کچھ دیر تک گہری نظر سے دیکھا پھر احتیاط سے کوٹ کے جیب میں رکھ لی۔

میں نے مسکرا کر بیوی سے کہا۔" جس طرح کی حرکتیں سلوچا کر رہا ہے اُنھیں دیکھ کر جی چاہتا ہے اسے جیل کی ہوا کھلا ہی دوں! کیوں تمہارا کیا خیال ہے۔ کے۔؟"

میری بیوی نے سلوچا کو ہنس کر بتایا۔" بھائی صاحب' یہ تو بات بات پر سب ہی کو جیل کی دھمکیاں دیا کرتے ہیں۔ ڈپٹی جیلر ہیں نا! ویسے بھی ان سے کوئی ملنے کے لئے آ جاتا ہے تو اُسے اپنی جیل کی یاترا ضرور کراتے ہیں۔ آپ کو بھی معلوم ہوتا ہے معاف نہیں کریں گے!"

میں نے ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھ کر اپنے شریر پر یونیفارم چڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا کروں، نوکری ہی ایسی ملی ہے! لوگوں کو جیل یاترا کرانے کی! اپنا گھر بھی تو ایک جیل خانہ ہی ہے! یہ بنگلہ بھلے ہی جیل کی اونچی چاردیواری سے باہر رکھا گیا ہے لیکن ہے تو جیل کا ہی ایک حصّہ ... ! ہم سے جو بھی ملنے آتا ہے وہ دراصل جیل میں ہی آجاتا ہے! چلو سلوجا تمہیں آج اس جیل کی پوری یاترا کرادوں!"

میں نے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی یونیفارم کا جائزہ لیا جسے پہن کر میں ایک دوسری شخصیت بن جاتا ہوں۔ اس کے سامنے میری بیوی بھی دب جاتی ہے۔ اپنی انتہائی دلکش شخصیت کے باوجود اسی وجہ سے میں اس سے بے پناہ پیار بھی کرتا ہوں۔ میں نے پلٹ کر سلوجا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اب مجھ سے پہلے سے کہیں زیادہ مرعوب نظر آرہا تھا۔ گو وہ اپنے خوبصورت سوٹ میں تھا۔ لیکن اس کی دلکشی شاید خود اس کی اپنی نظر میں بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا سیاہ پالشڈ بیٹن اس کے کاندھے سے چھو کر کہا۔ "چلئے جناب!"

سلوجا ایک مصنوعی سے تکلف سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "خدا کسی دشمن کو بھی جیلر دوست نصیب نہ کرے!"

کانتا نے پیچھے سے پکار کر کہا۔ "اپنے دوست کو بہت دیر تک قید میں نہ رکھئے گا۔ لنچ پر انھیں ذرا ٹائم سے لے کر آجائیے گا!"

میں نے بڑی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُسے پلٹ کر دیکھا اور بیٹن سے ہی دیو کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ بنگلے سے باہر نکلتے ہی کئی لوگ ملے۔ جان پہچان کے اور میری خوشنودی کے خواہش مند۔ ان سب نے مجھے سلام کیا۔ بعض لوگ راستہ چھوڑ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایسے وقت میں خود کو واقعی بہت اہم سمجھنے لگتا ہوں اپنی اہمیت کے احساس سے میں بے حد محظوظ بھی ہوتا ہوں۔ دنیا کی لذیذ ترین چیزوں میں شاید

اپنی اہمیت کا احساس سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے

لیکن میں نے سلوجا کو کسی بھی لمحہ نظر انداز نہ کیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہی چلتا رہا۔ جب ہم جیل کے مہیب پھاٹک میں داخل ہوئے تو وہاں بہت سے لوگ جو پہلے سے جمع تھے ہمیں راستہ دینے کے لئے ادھر اُدھر تیزی سے سرک گئے۔ بہت سے تو اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بعض ان کی رہائی کے منتظر تھے۔ پھاٹک کے بعد ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی وہاں جیل گارڈز کی فورس تعینات تھی۔ اس کے بعد ایک اور پھاٹک تھا۔ پہلے پھاٹک کی طرح مہیب، اونچا اور مضبوط۔ اس پھاٹک کے پار بہت سے قیدی کھڑے تھے۔ جو آج چھوٹنے والے تھے وہ اپنے قیدی ساتھیوں گلے مل مل کر رو رہے تھے۔ ایک دو تو ہنس ہنس کر جلدی ہی واپس آنے کے وعدے کر رہے تھے۔

سلوجا نے انہیں بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر یکایک جیسے اُس کے سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی ایک اور ہی دنیا آگئی۔ بارکیں، احاطے، کھیل کے میدان، چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے کئی سلسلے! ورکشاپ، ہینڈ لوم فیکٹریاں وغیرہ بھی! جتنے لوگ حدِ نظر تک گھومتے ہوئے دکھائی دیئے، اپنے اپنے کام میں بے حد مصروف اور اپنے حال میں مست۔ جیل کی فضا سے بے حد مانوس!

میں نے سلوجا سے کہا۔" یہاں سے تمہیں میری زندگی کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ یہ سب کوئی نہ کوئی جرم کر کے ہی یہاں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک آدھ کوئی کسی کی سازش سے یا عدالتوں کے غلط فیصلے کی ہی وجہ سے آگیا ہو! لیکن بیشتر کی تعداد مجرموں کی ہی ہے، مجھے ہر روز ان ہی سے نپٹنا پڑتا ہے۔ انہیں بگڑیل جانوروں کی سدھانا پڑتا ہے۔ اسکول ماسٹروں کو بچوں پر اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی ہوگی جتنی محنت مجھے ان ہر عمر کے غیر مہذبوں کو پھر سے انسان بنانے میں کرنی پڑتی ہے! ان کے ساتھ ساتھ ہی ان کی غیر مہذب اور مجرم فضا میں ہمیشہ رہنا بھی پڑتا ہے!"

سلوجا میری فصاحت سے زیادہ قیدیوں کی طرف متوجّہ تھا۔ جب میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا تو وہاں دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاندھی، نہرو، مہاتما بدھ! کچھ اسکیچ خوبصورت عورتوں کے بھی تھے۔ مناظر کشی بھی تھی۔ تجریدی آرٹ کے نمونے بھی۔

"یہ سب قیدیوں نے بنائے ہیں۔ ان کے کچھ خالق تو اپنی اپنی میعاد گذار کے چلے بھی گئے ہیں۔ لیکن بعض ابھی تک قید کاٹ رہے ہیں! ابھی ملاتا ہوں ان سے تمہیں!"

سلوجا کو جیسے یقین نہ آیا۔ ایسی مجرم فضا میں آرٹسٹ بھی پیدا ہو سکتے ہیں! یا کوئی اتنی اذیت ناک زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے اندر کے آرٹسٹ کو زندہ رکھنے میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے!

اُسی وقت ایک نیا قیدی داخل کرنے کے لئے لے آیا گیا۔ میں نے اس کے کاغذات کا معائنہ کرنے سے پہلے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد میں نے اس کا نام پتہ پوچھا اور رجسٹر میں درج کیا۔ اس کے رہنے کے لئے ایک بارک الاٹ کی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سلوجا کو اپنی طرف بڑی نفرت سے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے کہا۔ "تم بہت ظالم ہو! ایسا کبھی سوچا ہی نہ تھا میں نے!"

"نہیں! ایسا مت سوچو سلوجا! یہ تو میرے فرائض میں شامل ہے۔ اس قسم کا پہلا سائیکلوجیکل ٹریٹ منٹ بہت ضروری ہوتا ہے۔ قیدی کو یہاں لاتے ہی جہنم کی سی زندگی کا احساس کرایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ جیل کو ایک تفریح گاہ نہ سمجھ بیٹھے!"

سلوجا میری طرف ایک ٹک دیکھتا رہا۔ خاموش، سنجیدہ، کسی قدر سہما ہوا! مجھ سے پہلے سے کسی قدر زیادہ ہی متنفّر!

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسے بھی کچھ قیدی آ جاتے ہیں جو سختی اور اذیت کے باوجود جیل کو تفریح گاہ ہی سمجھتے ہیں۔ جیب کترے۔ نقب زن۔ اٹھائی گیرے وغیرہ۔ جن کو سزا

سال چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہاں سے جاتے ہی ہفتہ دس دن کے بعد پھر آجاتے ہیں۔ ان کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ اگرچہ میں ان کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہوں لیکن وہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں جیل سے باہر شہر میں کہیں بھی مل جاتے ہیں تو میرے پاس آکر سلام کرتے ہیں۔ میری خیریت پوچھتے ہیں لپک کر میرے برانڈ کا سگریٹ لے آتے ہیں جسے میں بخوشی قبول کر لیتا ہوں۔ اسے میں رشوت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میرا رویّہ تو کبھی بدلتا نہیں نا! اُن سے از راہ مذاق پوچھ لیتا ہوں۔ کب تک آ رہے ہو میرے پاس؟ وہ بھی ہنس کر بلکہ بڑے فخر سے جواب دیتے ہیں۔ بس حضور! کچھ ہی روز میں پہنچ جاؤں گا!"

یہ کہہ کر میں نے اپنا برانڈ سلگایا اور سلوجا سے کہا۔" چلو تمہیں مختلف قیدیوں سے ملا لاؤں۔"

پہلے ہم زنانہ وارڈ میں گئے۔ کچھ جوان اور ادھیڑ عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ تیز کلامی میں مصروف تھیں۔ دو عورتیں ان کے جھگڑے سے بے نیاز ایک دوسرے کے بال کاٹنے میں لگی ہوئی تھیں۔ دو پتھروں کو ایک دوسرے پر مار مار کر انھوں نے کٹے ہوئے بالوں کا زمین پر ڈھیر سا لگا رکھا تھا۔ وہ اپنے سامنے یکایک مجھے کھڑا دیکھ کر مسکرا دیں بے حد ناپاک اور ہونٹوں کے ساتھ بالکل چپکی ہوئی سی مسکراہٹ! ایک نے دونوں ہاتھوں میں سارے بال سمیٹ کر میرے سامنے کر دیئے۔" لیجئے کمار صاحب انھیں میرے عاشقوں میں تقسیم کرا دیجئے گا!"

مجھے دیکھ کر جھگڑتی ہوئی عورتیں بھی خاموش ہو گئیں۔ زنانہ وارڈن انھیں اپنی اپنی بارک میں چلے جانے کے لئے پھٹکارنے لگی۔ تو ایک عورت نے میری طرف ہوائی بوسہ اُچھال کر کہا۔" دیکھو ڈیر! تم اپنی وارڈر کو منع بھی نہیں کرتے! تمہیں جی بھر کر دیکھنے بھی نہیں دے رہی ہے حرامزادی!"

میں سلوجا کو جلدی سے باہر لے آیا' کہا۔" جیل میں رہ کر ہر کوئی شرم وحیا

سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ مرد اور عورتیں سبھی ! یہاں کچھ دیر اور رُکے ہوتے تو ایسی ایسی بجو اس سننے کو ملتی کہ تم اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے !"

مردوں کے ایک وارڈ میں جاتے ہی بہت سے قیدی ہمارے گرد جمع ہو گئے ۔ بڑی شوخی سے ایک دوسرے کی بیہودگیوں کی شکائتیں کرنے لگے جیسے جانتے ہوں میں اپنے مہمان کی موجودگی میں ان سے کچھ نہیں کہوں گا ۔ میں نے ایک معمر قیدی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور سمجھایا ۔ "یہ سب تمہارے بچے ہیں ! انہیں اخلاق سکھایا کرو اخلاق !"

وہ سب جسم کے بھوکے تھے ۔ سالہا سال جیل میں رہ کر عورت کا ذائقہ بھول چکے تھے ۔ عورت کی بہت دور سے ہی خوشبو سونگھ کر عشقیہ کورس گانے لگتے تھے ' اس لئے عورتوں کا وارڈ ان کی پہنچ سے بہت دور بنایا گیا تھا ۔

سلوجا نے ان کی باتیں بہت توجہ سے سنیں ۔ ان کی بارکوں میں بنے ہوئے سمنٹ اور پتھروں کی بیڈ بھی دیکھے جن پر وہ سوتے تھے ۔ ان کے پیچھے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے لاکر بھی دیکھے جن میں وہ اپنے کپڑے اور کھانے کے برتن رکھتے تھے ۔

تھیٹر میں کچھ قیدی کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے ۔ میرے کہنے پر انہوں نے سلوجا کو کچھ ڈائیلاگ بول کر سنائے ۔ مغلیہ عہد کا ہی کوئی ڈرامہ تھا ۔ جن قیدیوں کو گھومنے پھرنے کی آزادی ملی ہوتی ہے وہ سب یہاں جمع ہو جاتے ہیں ۔ ان کے ڈرامے دیکھنے کے لئے کبھی کبھی باہر کے تماشائی بھی آ جاتے ہیں ۔ جیسے کمشنر، کوئی منسٹر وغیرہ ! قیدیوں کا من بہلانے کے لئے یہاں کبھی کبھی مشاعرے بھی کرائے جاتے ہیں ۔ یہ لوگ بھی اپنے بنائے ہوئے شعر سنایا کرتے ہیں !

سلوجا نے اوپن ایئر تھیٹر کے پنج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی ۔ شاید اُسے دور دور تک بنی ہوئی کوٹھریاں اور بارکیں اور عمارتیں بجھر کر بیٹھے ہوئے تماشائیوں

کی طرح لگیں۔ جیسے وہ ان کے سامنے ابھی کوئی ناٹک پیش کرنے والا ہو! لیکن وہ کچھ کہے بغیر جلدی ہی بنچ پر سے اتر آیا۔ اپنی سوچوں میں بالکل ڈوبا ہوا سا!

وہاں سے نکل کر ہم عمر قید کے خطرناک قیدیوں کے پاس گئے۔ انہیں ہمیشہ بند ہی رکھا جاتا ہے۔ کبھی کوٹھری سے نکالا نہیں جاتا۔ چھوٹی چھوٹی سلاخوں والی کوٹھریوں میں کئی قسم کے مجرم بند تھے۔ قتل کے۔ ڈکیتی کے۔ سازش وغیرہ کے!

ایک سردار کی مونچھوں کے کونے غیر معمولی طور پر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں انتہائی وحشت تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر بڑی تمکنت سے کہا۔ "کیئے کمار صاحب ہمیں دکھانے کے لئے آج کس وزیٹر کو لے کر آئے ہو؟ اسے کہو دو چار روز ہمارے ساتھ ہی کوٹھری میں رہ کر دیکھے تو!"

میں نے سلوجا کو بتایا۔ "یہ انتہائی سفاک قسم کے قاتلوں میں سے ہے۔ اسے اگر ایک ہی گھنٹے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو باہر جاتے ہی آٹھ دس قتل تو کر ہی ڈالے گا۔ قتل کرنے میں اسے بڑی لذت ملتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کو قتل کرنے میں!" سلوجا نے اس قیدی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

ایک اور قیدی جو بالکل بوڑھا ہو چکا تھا اور جس نے ہمیشہ بچوں کے ہی قتل کئے تھے، اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال کی وجہ سے بالکل گرو دیو ٹیگور ہی لگتا تھا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی وہ بہت ہی نرم اور شیریں آواز میں بولا۔ "شت شت پرنام جیلر صاحب آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات پوچھنا ہے۔ میں کئی برسوں سے ایک الجھن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرا وشواس ہے مجھے اس دُوِدھا سے نکالنے میں آپ ہی میری سہاتا کر سکتے ہیں۔ اچھا بتائیے مرتیو اور جیون میں لوجیکل انتر کیا ہے؟ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ جو لوگ خود کو زندہ بتاتے ہیں وہ واستو میں زندہ بھی ہیں یا نہیں! اور جن کو ہم مرا ہوا ڈیکلیر کر

پکے ہیں وہ ہو سکتا ہے در اصل مرے ہی نہ ہوں۔ ہمارے بیچ میں ہی رہ کر ہمارے ایٹی ٹیوڈ کا لطف لیتے رہتے ہوں! جیلر صاحب میری بات کا جواب دیتے جائیے! آپ کو اپنے خدا کا واسطہ اپنے گریٹ فیتھ کا! بس ایک منٹ کے لئے اور رک جائیے! یو ڈیم کرمینل! اٹھو! اٹھو!!"

"سالا تنہائی کی آگ میں بھن بھن کر فلاسفر ہوتا جا رہا ہے!" میں نے بڑی خجالت سے سلو جا کو آگے بڑھایا۔ آگے کی کوٹھری میں ایک انگریز بند تھا۔ جسے میں نے ایک سگریٹ آفر کی اور سلوجا کو بتایا۔" یہ ایک بہت بڑا انٹرنیشنل چیٹ ہے۔ مختلف قسم کی فرموں سے ساز باز کرکے فارن ایکسچینج میں کروڑوں کا ہیر پھیر کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

سیاسی اور کلاس ون قیدیوں کی رہائش گاہیں بنگلہ نما ہیں، برآمدے، چقیں، آرام کرسیاں، ٹیبل لیمپ، بجلی کے پنکھے، اخبارات، کتابیں، ریڈیو، ٹینس یا بیڈمنٹن کورٹ! سب کچھ انھیں مہیا ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر یا تو بستروں پر دراز تھے یا آرام کرسیوں پر بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ پائپ کی جلی راکھ کرید رہے تھے اور مطالعہ میں مصروف تھے۔ یہ لوگ موڈ ہونے پر ہی بات کرتے ہیں ورنہ عام طور پر ہوں ہاں یں ہی جواب دے کر ٹال جاتے ہیں۔ مجھے اور سلوجا کو دیکھ کر انھوں نے بس بہت ہی کم کے لئے سر اٹھایا اس کے بعد مطالعے میں پھر غرق ہو گئے۔ ایک صاحب تو کئی مہینوں سے کوئی بڑی کتاب لکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی میز پر کاغذات کا ایک پلندہ بندھا پڑا تھا۔

سلوجا بولا۔" معلوم ہوتا ہے یہاں تنہائی ہی سب سے بڑی سزا ہے! ان سب کے چہرے تنہائی سے ہی داغے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ در اصل ہم لوگوں کو ہی قیدی سمجھتے ہوں! ہم جو ان کی دنیا سے باہر رہتے ہیں!"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔" یہاں تھوڑی ہی دیر رہ کر تم پر بھی جیسے فلاسفی اترنے لگ گئی ہے اب مجھے تو یہ ڈر لگ رہا ہے کہیں تم یہیں رہنے کا فیصلہ ہی نہ کر ڈالو!"

یہ سن کر اس نے گھڑی دیکھی۔ کہا۔" ان لوگوں کے وقت کے بارے میں بھی عجب احساسات ہوں گے! لیکن اب واپس نہ چلیں! ایک بجنے کو ہیں!"

میں سمجھ گیا۔ سلوجا اب چلتے چلتے تھک گیا ہے۔ جس طرح وہ قدم اٹھاتا تھا ان سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ اب ہم پھانسی پانے کے منتظر قیدیوں کی کوٹھریوں کے عین سامنے پہنچ چکے تھے، میں نے کہا۔ "اب جیل کا یہ مختصر مگر اہم ترین گوشہ بھی دیکھتے چلو۔ پھر پتہ نہیں تم کب ادھر آسکو۔"

چھوٹے سے احاطے میں چھ کوٹھریاں تھیں۔ دو خالی تھیں انکے مکینوں کو دو روز قبل پھانسی پر لٹکایا جا چکا تھا۔ چار ابھی موجود تھے۔ اپنی اپیلوں کے فیصلے کے منتظر! چاروں کے چہرے موت کی طرح زرد۔ وقت کا ہر لمحہ ان کے خون سے خراج وصول کر رہا تھا۔

سلوجا سلاخوں کے بہت پاس جا کر انہیں دیکھنے لگا۔ گہری خاموشی ہے۔

ایک آدمی گیتا پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے ہماری آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ دوسرا آدمی اپنے ہاتھ میں ایک جاسوسی ناول لیے کھڑا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "کمار صاحب کوئی نیا ناول بھجوا دیں نا! اسے تو کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ اب کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی!"

میں نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "ایک بار اور پڑھ ڈالو۔ شام کو کوئی دوسرا بھجوا دوں گا!"

تیسری کوٹھری کا قیدی سلاخوں سے ساتھ چپکا ہم لوگوں کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا۔ اپنی ایک آنکھ سے اس کی دوسری آنکھ دائمی طور پر بند تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایک آنکھ بند کر رکھی ہے! کھلی ہوئی آنکھ میں جو حسرت اور بے بسی کی کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے!

چوتھا قیدی ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی سے اپنے بال سنوارنے میں لگا ہوا تھا جتنا سناٹا اس جگہ رہتا ہے اتنا اور کہیں بھی نہیں ہوتا!

ان قیدیوں سے بیس گز کے فاصلے پر ایک اور اونچی دیوار تھی۔ دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ سلوجا کو میں اسی طرف چھوٹے سے ایک اور احاطے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ چند فٹ اونچا ایک پلیٹ فارم تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک کنواں تھا۔

اس پر لکڑی کے تختے رکھے ہوئے تھے۔ دو پولوں پر زمین کے متوازی ایک مضبوط لٹھے کے ساتھ ایک ریشمی رسہ لٹک رہا تھا۔ پھندے کی شکل بنائے ہوئے جس کا دوسرا سرا لٹھے کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔

سلوجا نے حیران ہو کر پوچھا "کیا پھانسی اسی جگہ پر دی جاتی ہے؟"

"ہاں یہی وہ جگہ ہے جہاں اب تک بلا مبالغہ ہزاروں آدمی جھول چکے ہوں گے!"

اُسے جیسے یقین نہ آیا۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا وہ پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ کنوئیں پر پڑے ہوئے تختوں کے اوپر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھانسی کے عین نیچے۔ ایک ہاتھ سے پھندے کو چھو کر بولا۔ "کیا اسی کو گلے میں پہن لینے کے بعد نیچے کا تختہ گر جاتا ہے۔"

اس نے ایک معصوم بچے کی سی حیرانی کے ساتھ ایک ایک تفصیل جاننا چاہی تو مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پلیٹ فارم کے پاس لگے ایک ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے بتایا۔ "اسے پیچھے کی طرف دباتے ہی پاؤں کے نیچے سے دونوں تختے کھسک جاتے ہیں اور پھانسی پانے والا ایک ہی جھٹکے سے جھول جاتا ہے!"

اس نے پھندا اپنے گلے میں پہن لیا اور پوچھا۔ "کیا ایسے؟"

"ہاں اور ریشمی رسے کی ناٹ بالکل نرخرے کے ہی اوپر رکھ دی جاتی ہے!"

سلوجا نے رسے کی گانٹھ اپنے نرخرے کے عین اوپر رکھ لی اور رسے کی گرفت بھی قدرے سخت کر لی۔

میں نے اسے ایسا کرتے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تم موت کی بالکل زد میں ہو۔ میرے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے تم جھول جاؤ گے! کیا میں تم سے تمہاری آخری خواہش پوچھوں؟ جیسا کہ جیل کے قاعدے کے مطابق مرنے والوں سے پوچھا جاتا ہے!"

سلوجا نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ لمحوں تک خاموش ہی کھڑا رہا۔ اُسی طرح گلے میں پھندا ڈالے۔ میری طرف ٹکٹکی لگائے اور بیحد سنجیدہ۔

میں نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔" تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ بولو تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟"

سلوجا پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ ہو اٹھا۔ اس کی میری طرف لگی ہوئی ٹکٹکی بھی طویل ہوگئی۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔" میری آخری خواہش یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے اپنے ایک جرم کا اعتراف کرلوں۔ اس جرم کا تمہیں آج تک علم نہیں ہو سکا۔ کیا تم میرا اعتراف سننے کے لئے تیار ہو؟"

میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔" ہاں بالکل تیار ہوں۔ لیکن سب سچ سچ ہی کہنا۔ اس سے تمہیں مرنے کے بعد شانتی بھی ملے گی!"

سلوجا کے چہرے پر انتہائی کرب اور بے چینی پیدا ہوگئی جیسے کوئی بات اس کی زبان تک آتے آتے پلٹ جاتی ہے۔ میں نے ذرا تحکم سے کہا۔" جلدی بتاؤ تم کون سے جرم کا اعتراف کرنا چاہتے ہو؟"

سلوجا نے جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔" جس لڑکی سے ہم دونوں پیار کرتے تھے نا۔ اس کی موت کے لئے دراصل میں ہی ذمہّ دار تھا!"

یہ سن کر میرا ہنسی کا موڈ آف ہوگیا میرا ہاتھ بھی یکایک کانپ اٹھا۔ لیکن میں ہینڈل کو بڑی سختی سے تھامے رہا۔ اور اس سے بہت ہی غضبناک ہو کر پوچھا۔" تم ذمہّ دار تھے! تم کس طرح؟ کیسے؟ جلدی بتاؤ نہیں تو میں تمہیں یہیں پر ہی پھانسی دے دوں گا!"

اس نے میرے غصےّ کے سامنے کوئی گھبراہٹ نہ دکھائی۔ پہلے کی طرح اداس متوازن اور بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔" مجھے معلوم تھا دوشی تم سے ہی پیار کرتی ہے۔ لیکن یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ میں اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جلتا رہتا تھا۔ چاہتا تھا وہ کسی طرح تمہارا خیال چھوڑ دے! میرے قریب آجائے

روشنی کو میں نے کئی مرتبہ سمجھایا تھا۔ تمہاری برائی بھی کی تھی۔ اور اُسے کئی طریقوں سے ڈرایا، دھمکایا بھی تھا۔ لیکن وہ اپنے ارادے کی بڑی پکّی تھی۔ میری دھمکیوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے مجبور ہو کر ایک آخری حربہ استعمال کرنا چاہا۔ اُسے کہہ دیا کہ اب میں کمار کو ہی اپنے راستے سے ہٹا دوں گا۔ میں سچ مچ تمہیں مار ڈالنے کے منصوبے سوچا کرتا تھا۔ تمہیں کبھی پتہ بھی نہ لگ سکا۔ ایک بار ہم صبح کی گاڑی سے گھر واپس جانے والے تھے۔ اسی روز میں نے تمہیں گاڑی سے دھکّا دے دینے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ بات روشنی کو بھی بتا دی تھی، اس خیال سے کہ وہ اب بھی تمہارا دم بھرنے سے باز آ جائے۔ اس رات بہت بارش ہوتی رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے اُس روز سردی بھی کتنی تھی! میں اپنے کمرے میں بستر کے اندر پڑا پڑا صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور باہر مسلسل سخت بارش ہونے کی آواز بھی سن رہا تھا۔ میرے دروازے پر مسلسل بوچھار پڑ رہی تھی۔ درزوں سے پانی بھی اندر آ رہا تھا، فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ میں روشنی کے ریٹائرڈ کپتان باپ کے مکان کی سب سے اوپر والی منزل پر رہتا تھا نا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں اکیلا اچانک روشنی بارش میں بھیگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اُسے دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ سوچ کر کہ آخر اس نے ہار مان لی! لیکن وہ تو آتے ہی مجھ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ میں نے غصّے میں آ کر اُسے باہر نکال دیا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ عورت کتنی عجیب ہوتی ہے! وہ اپنی دھن میں کیا نہیں کر سکتی۔ مرد بھی بڑا عجیب جانور ہوتا ہے ایک خاص عورت پانے کے لئے اپنے آپ کو کس قدر پاگل بنا لیتا ہے! وہ رات بھر میرا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی اور روتی رہی۔ اور بارش میں بھیگتی رہی۔ میں نے بھی پختہ ارادہ کر لیا تھا اب تمہیں مار کر ہی چھوڑوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے پتہ نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اچانک ہی تمہاری آواز سن کر میں نے دروازہ کھولا تھا۔ میرا خیال تھا اسٹیشن پر جانے کے لئے تم ٹیکسی لے کر آئے

ہوئے! لیکن تم تو اپنا پروگرام ملتوی کر دینے کی خبر دے کر آئے تھے۔ کیونکہ روشنی کو نمونیا ہو
گیا تھا۔ تم صبح ہوتے ہی اس سے ملنے چلے گئے تھے۔ تب ہی یہ بات تمہیں معلوم ہوئی
تھی۔ لیکن روشنی نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ وہ رات کو سردی اور بارش میں کہاں
بھیگتی رہی تھی۔ تم اس کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے تم وہیں
رہ گئے اور میں چلا گیا۔ دل میں ایک عجیب سی مسرت دبائے۔ اچھا ہوا اسے سز
مل گئی۔ تم نے کئی روز بعد مجھے ایک دکھ بھرا خط لکھا روشنی مر گئی تھی۔ تمہاری دنیا
ویران ہو گئی تھی۔ تمہاری پہلی محبت کا انجام واقعی دردناک تھا۔ لیکن میری پہلی
محبت کا انجام بھی کچھ کم دردناک نہیں تھا۔ میں بھی اپنی جگہ بہت دکھی تھا۔ لیکن اصلی
بات کسی کو نہ بتا سکا۔ اسے آج تک سینے میں چھپائے چھپائے پھرتا رہا۔ تم سے دور دو
کتنے برسوں سے تم سے نہیں ملا۔ اسی وجہ سے تمہارے خط آتے رہے۔ تم اپنے یہاں
آنے کے لئے انوائیٹ کرتے رہے۔ لیکن میں تو تمہارے سامنے ہونے سے ڈرتا تھا۔
آج اتفاق سے تمہارے یہاں آنکلا۔ آج اتفاق سے جیل میں بھی پہنچ گیا اور پھانسی
اس پھندے تک بھی جس کا میں بجا طور پر مستحق تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میرے ضمیر
مجھ سے سب کچھ کہلوا لیا۔ اب سزا دینا تمہارے ہاتھ میں ہے تم اس ہینڈل کو
دبا سکتے ہو۔ ذرا سا جھکا ہی دو۔ میں اپنے جرم کی سزا پانے کے لئے تیار ہوں۔
سچے دل سے!"

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ اپنی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لئے! سچائی کی
چمک! سچائی جو اس کے اندر سے ابھر کر سطح پر آ گئی تھی۔ بوجھ سے آزاد ہو جانے
تسکین پا لینے کی خوشی بھی آ گئی تھی اس کے چہرے پر۔ لیکن میں خاموش کھڑ
رہا۔ تناؤ سے بھرا ہوا۔ اور ایک قسم کے سکتے میں بھی! میں اسے کوئی جواب
نہ دے سکا۔ آخر اسی نے مجھ سے کہا۔" سوچ کیا رہے ہو! میرے جرم کی

سزا پھانسی نہیں ہے ؟"

میں نے بڑی جدوجہد میں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں جرم کی سزا پھانسی نہیں ہوا کرتی، جب تک وہ ثابت بھی نہ ہو جائے۔ تم سے جو کچھ ہوا ایک خاص لمحہ میں ہوا۔ ایک خاص کیفیت میں ہوا۔ تم کسی کی بھی جان نہیں لے سکتے تھے۔ میری بھی نہیں میں جانتا ہوں تم اتنے بہادر کبھی بھی نہیں رہے۔ جو کچھ تم نے روشی سے کہا وہ تمہارا ایک جذباتی ابال تھا! محض! بس اور کچھ نہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے ہینڈل پر سے ہاتھ ہٹالیا۔ اس سے کہا۔ "نیچے آجاؤ۔ اب گھر چلیں۔ کانتا کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی ہوگی!"

لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ بولا۔ "تم بہت فراخ دل ہو۔ بے حد محبت کرنے والے دوست! معصوم اور سچے۔ تمہارے مقابلے میں میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں بہت کمینہ ہوں۔ تم نے دیکھ لیا نا! مجھے یہاں سے مت اتارو۔ اپنے ہاتھ سے ہی پھانسی دے کر میری آخری خواہش کی تکمیل کر دو۔ پلیز! کمار، جلدی کرو! یہ لمحے کانٹے بن کر مجھے ہر طرف سے چبھ رہے ہیں!"

میں نے اس کی طرف شک کی نظر سے دیکھا۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے! پلیٹ فارم پر جاکر اس کے گلے سے زبردستی پھندا نکالا اور اسے نیچے لے آتے ہوئے کہا۔ "تمہارے جرم کی یہی سزا کیا کم ہے کہ تم اتنی مدت سے اکیلے بھٹکتے پھرتے ہو!"

سلوجا نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیل کی چار دیواری سے باہر آکر بھی وہ اُسی طرح افسردہ رہا۔ جس بوجھ سے وہ آزاد ہونا چاہتا تھا، وہ ابھی تک اس کے ذہن پر موجود تھا۔ صبح اس نے جو بشاشت دکھائی تھی۔ اس سے اب وہ بالکل ناواقف معلوم ہوتا تھا۔

اسے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر کانتا بھی حیران ہوئی۔ اس نے سلوجا کے لئے کئی قسم کے لذیذ کھانے بنا رکھے تھے۔ وہ توقع رکھتی تھی کہ سلوجا آتے ہی ان کھانوں پر ٹوٹ پڑے گا۔

بھوکے بھیڑیے کی طرح۔ اور جی بھر کر اس کی تعریف بھی کرے گا۔ یہ توقع عورت ذات کی فطرت
کے خلاف نہیں تھی۔ ہر عورت اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے یہی توقع رکھتی ہے۔ جن کی
وہ بڑی خاطر تواضع کیا کرتی ہے۔ لیکن سلوجا نے تو کھانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی
کانتا نے اس کا سبب پوچھنا چاہا تو اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ اس سے کانتا کو بڑا صدمہ
اس نے توہین محسوس کی۔ جیسے اُسے ٹھوکر مار دی گئی ہو! نظر انداز کر دیا گیا ہو! وہ اب غصے
میں بھر کر اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے سلوجا سے مزید کچھ بھی پوچھنے سے منع کر دیا
کھانا کھانے کے بعد سلوجا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں اس کا سامان رکھا گیا تھا۔
کانتا اور میں اپنے کمرے میں آگئے۔ آرام کرنے کے لئے۔ میں نہیں چاہتا تھا آج کے واقعے کے
متعلق اُسے کچھ بتاؤں۔ لیکن اس نے کرید کرید کر سلوجا کی اداسی کے بارے میں پوچھا تو اُسے
سب کچھ بتانا پڑا۔ سب کچھ جان کر وہ خوف زدہ ہو اٹھی! بڑی تشویش سے بولی۔" اگر آپ
نے غصے میں کہیں سچ مچ ہینڈ بار دیا ہوتا تو!!"
میں نے اُسے پیار کرتے ہوئے بتایا۔" ہاں بیشک میں ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن میں
نے ہینڈل دبانے کے بجائے اپنے غصے کو ہی دبایا! اس طرح وہ میرے ہاتھ سے سزا
پانے سے بچ گیا مر جاتا تو میری بھی خیریت کہاں ہوتی! میرے گلے میں بھی تو پھانسی کا پھندا
آپڑتا کسی روز!"
کے نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔" بولی بیکار مت بولئے۔ اب سو جائیے!"
ہم دونوں کافی دیر تک سوتے رہے۔ خوب گہری نیند۔ خوب پیٹ بھر کے کھانا
کھایا تھا نا! لیکن کانتا مجھ سے پہلے ہی جاگی۔
ساڑھے چار بجے کے قریب کانتا نے مجھے چائے کے لئے جگایا۔ نوکر کو سلوجا کے
کمرے میں بھیجا تاکہ اسے بھی چائے کے لئے بلا لائے۔ لیکن نوکر وہاں جاتے ہی چیختا
ہوا پلٹ آیا۔ خوف اور حیرانی سے کانپتا ہوا۔ بولا۔" صاحب تو سیلنگ فین کے ساتھ
بیڈ شیٹ باندھ کر لٹک رہے ہیں!!"

اقبال متین

کاٹا ہوا نام

میری تعیناتی بمبئی کے ایک ہاسپٹل کے ایڈمشن سیکشن کے انسپکشن افسر کی حیثیت سے عمل میں آئی ہے۔ میں پندرہ روز سے ٹھیک آٹھ بجے شب کو اپنی ڈیوٹی پر آرہا ہوں۔ گویا جب رات جاگنے لگتی ہے۔ سڑکوں، دوکانوں، سینما ہالوں اور تماشہ گاہوں میں آدمیوں کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو میں بھی اس بھیڑ بھاڑ سے ہو کر گذرتا اور بہت سی نرسوں، وارڈ بائز اور آیاؤں کے ہمراہ جنرل ہاسپٹل کے صدر دروازے میں داخل ہوتا ہوں اور دواخانے کی عمارت میں پہنچتے پہنچتے سارا ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ میں محسوس کرتا ہوں وہی سب کچھ میرے دوسرے ساتھی کیوں نہیں محسوس کرتے جو میرے ساتھ ڈیوٹی پر چڑھتے ہیں۔

پمی کے جوڑے کے پھولوں کی شگفتگی آخر مجھے کیوں کھلتی ہے۔ رمبھا اگر اتنا سینٹ لگاتی ہے کہ پاس گزرنے والا ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر آگے نہیں جا سکتا تو اس میں میرے لئے دکھ کا کونسا پہلو نکل آتا ہے۔ کینٹن کی سپلائی گرل سے میل نرس راجن پینگ بڑھاتا ہوا دیکھا گیا ہے تو اس میں میرے لئے اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے تو لیڈی ڈاکٹروں کے ہونٹوں پر لپاسٹک بھی کھل جاتی ہے اور یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ قہقہہ لگا کر کوئی کسی وارڈ میں کس طرح ہنس سکتا ہے جب کہ کتنے ہی مریض کراہنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔ لیکن لوگ ہنستے ہیں تو میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ یہ ساری باتیں سوچنے کے لئے میری تعیناتی یہاں نہیں ہوئی۔ میرا کام تو صرف اتنا ہے کہ انھیں اس حرکت پر ٹوک دوں کیوں کہ میں انسپکشن افسر ہوں۔ رہ گئی یہ بات کہ یہ سب کچھ ہو کیسے

سکتا ہے تو میں کون ہوں جو یہ سوچوں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے۔ دواخانے میں وہ انسان مجھے نہیں ملا جس کی میں تلاش میں ہوں۔ خدا ضرور ملتا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ دواخانے میں خدا کی ضرورت ہے اور اسے دواخانے سے نکال باہر کرنا شاید ابھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

ڈیوٹی افسر نے مجھ سے کہا تھا۔ "تمہارا قدم نیک ہے رائے۔ جب سے تم آئے ہو اموات کی شرح کم ہے۔" مجھے یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔ اور اگر اموات کی شرح بڑھ جاتی تو کیا اس کمی میں میرا کوئی حصہ ہے۔ نہ افسانے میں۔ لیکن کیا ڈاکٹر دوسری صورت حال کو بھی میرے نام سے منسوب کرتا؟

وارڈ نمبر ۔ کے بیڈ نمبر ۱۳ کا مریض مر گیا تھا۔ نوجوان آدمی۔ اس کا باپ اور اس کا دادا اس کی لاش کے ساتھ تھے۔ جب لاش جنرل کیریر میں مورچری کو لے جانے کے لئے میرے پاس لائی گئی تو میں نے صداقت نامہ فوتی کی اجرائی کے لئے رجسٹر کھولا۔ جانے ایسے کتنے صداقت نامے مجھے دینے ہوں گے۔ مریض کی عمر سن کر میرے ہاتھ کانپ گئے۔ ۲۴ سال ـــ اور یہ بیماری۔

"او نہہ ـــ کچھ بھی لکھو صاحب۔ خانہ پوری جلدی کرو ـــ میری ڈیوٹی بدل رہی ہے۔"

یہ وارڈ بائے تھا جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ "ہاتھ جلدی جلدی چلاؤ صاحب۔" اس نے پھر کہا۔

"ہاں بھائی سیکھ جاؤں گا آہستہ آہستہ" ۔ میں وارڈ بائے کو جواب دیتا ہوں۔

میرا ذہن ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ جانے کیا کیا الم غلم سوچ رہا تھا۔ جوں توں کر کے میں نے اندراج کیا اور جھپٹ کر صداقت نامہ وارڈ بائے نے لے لیا۔

اس نے مورچری میں لاش پہنچا دی تو لوٹ کر کہا ـــ "کیا صاحب پیٹ پر مٹی ڈالتے ہو سرٹیفکیٹ مجھے دیا کرنا۔ کچھ دام کھرے کر لیتا ہوں۔"

"دام کھرے کرتے ہو؟"

"ہاں صاحب بس یہی انعام اکرام"

"انعام اکرام؟ ۔ مر جانے کی خوشی میں؟"

" یہ دواخانہ ہے صاحب ۔ یہاں آدمی زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔ تیسری کوئی صورت تو ہے نہیں ۔ یہاں نہ کسی کی شادی ہو گی نہ تسمیہ خوانی نہ روزہ رکھائی۔ نہ کسی کامیابی پر گلپوشی پھر ایسے میں کیا ہی کیا جا سکتا ہے ۔ مریض صحت پا جائے تو صحت پانے کا انعام ۔ مریض مر جائے تو مر جانے کا انعام"

اس نے خشونت سے بات کی جیسے میں اس کے حقوق تلف کرنے کے درپے ہوں ۔

میں اس کا منھ تکتا رہ گیا ۔

ہفتہ بھر پہلے ایک عورت پاس کے وارڈ میں شریک ہوئی ہے ۔ اس کا شوہر روز آنہ دو ایک بار دواخانے کا چکر لگا جاتا ہے ۔ بے حد خاموش اور کم گو آدمی ہے ۔ شروع شروع میں جب عورت کی طبیعت خراب تھی ۔ میں نے اس کو رات رات بھر کرسی پر پاس بیٹھے ہوئے دیکھا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ میں رات کو وارڈ میں اس کی موجودگی پر معترض ہو سکتا ہوں لیکن میں نے کبھی اس کو نہیں ٹوکا ہے ۔ اس نے بھی کبھی میرا شکریہ ادا کرنے کی زحمت نہیں کی جب کبھی اس سے نظریں ملیں ، اس نے بھی نظریں جھکا لیں ، میں نے بھی ۔ لیکن اب اس کی بیوی اچھی ہو رہی ہے ۔ بے حد ہنس مکھ اور قبول صورت عورت ہے ۔ باتیں بہت کرتی اور اس سے زیادہ ہنستی ہے ۔ اس کا شوہر اس کی ضد ہے ۔ وہ باتیں بہت کم کرتا ہے اور کبھی نہیں ہنستا ۔ میں دونوں میں ہی دلچسپی لینے لگا ہوں ۔ یہ جو ایک دوسرے کی ضد ہیں ان کی زندگی میں قرب کے کتنے فاصلے ہوں گے ۔ لیکن پرسوں دن کے اجالے میں کھڑی دوپہر کی چھنکتی ہوئی دھوپ میں ، میں نے ایک عجیب بات دیکھی ۔ اتفاق سے میری دن کی عارضی ڈیوٹی کا یہ دوسرا دن تھا ۔ وہ پورٹیکو کے پیچھے باڑھ میں چھپا ہوا رو رہا تھا ۔ میں قریب سے گزرتے گزرتے ٹھٹھک گیا ۔ اس کو پہچان کر میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں نے اس کے آنسو نہیں دیکھے ۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں پر عینک چڑھا کر مجھے اندھا بنانے کی کوشش کی جیسے اس کے عینک چڑھا

لینے سے میری عینک اتر جائے گی۔

میں نے سلام کر کے پوچھا۔ "کیسی ہیں؟"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "بالکل اچھی ہیں۔ شکریہ"

میں نے کم ہی ایسی زخمی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ خاموش ہو رہا اور آگے بڑھ گیا۔

کل صبح جب میں ڈیوٹی پر آیا تھا تو مجھے دو باتوں نے اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ مجھ سے شکایت کی گئی تھی کہ بیڈ نمبر دس کے مریض کو پچھلی شام نہ موسمبیاں دی گئی تھیں نہ انڈا، اور دودھ بھی اندازے سے کم دیا گیا تھا۔ ایک اور شکایت کسی اور بیڈ کی تھی نمبر مجھے یاد نہیں اور وہ یہ تھی کہ رات جو انجکشن مریض کو لگایا جانا چاہیے تھا وہ نہیں لگایا گیا اور بجائے ایک کے دو گولیاں نیند کی دی گئیں میں نے شیٹ نکالی۔۔۔ دیکھا تو ہدایتیں واضح تھیں اور عمل وہ نہیں کیا گیا تھا جو شیٹ میں درج تھا لیکن میں اس کیس کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا کیونکہ جس وقت انجکشن بچایا گیا تھا اس وقت ڈیوٹی میری نہ تھی میں نے کمپلین بک میں شکایت درج کی اور نرس کے حوالے کر دیا کہ متعلق انسپکشن افسر کو دے دے۔ بیڈ نمبر ۱۰ کے موسمبیوں انڈے اور دودھ کے متعلق مجھے معلومات ہوئیں پتہ چلا کہ یہ وارڈ بائے اور ڈائٹ سپلائر دونوں کے کرشمے ہیں۔

میں نے مریض سے براہ راست بات چیت کی۔۔۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ کوئی ایک ہفتہ سے ایک دن آڑہ اس کی غذا کسی نہ کسی بہانے اسی طرح ٹالی جا رہی ہے۔ میں نے پوچھا "پھر تم نے اپنی شکایت میں یہ کیوں نہیں بتایا؟" مریض کہنے لگا "شکایت میرے بیٹے نے کی ہے صاحب۔ جوانی کا خون ہے۔ معاف کر دیجیے اسے پانی میں رہ کر"

میں نے بڈھے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے بچے نے جو کچھ کیا ہے درست کیا ہے لیکن وہ برابر مجھ سے معافی چاہے جا رہا تھا۔

میں پھر سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ اس واقعے سے اس آدمی کا کوئی تعلق نہیں ہے جو مجھے باڑہ کے پاس آنسو چھپاتا ہوا ملا تھا۔ اور جس کی بیوی خوبصورت بھی تھی، ہنس مکھ بھی

اور اب تو صحت یاب سی تھی ـــ

کیا اس کی بیوی کو بھی لکھی ہوئی دوائیں اور غذا حسب ہدایت نہیں دی جا رہی ہیں۔

یہ سوال میرے ذہن میں لمحہ بھر کے لئے ابھرا لیکن خود میں نے ہی اس کی تردید کر لی۔ اس کی بیوی تو ڈاکٹروں میں بے حد مقبول ہے ـــ کتنی ہی لیڈی ڈاکٹروں سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ نرسیں اور وارڈ بائز پر دھونس جماتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے شکایت کروں گی۔ آر۔ ایم۔ او۔ سے کہہ کر تادیبی کارروائی کرواؤں گی ویسے اس کی اہمیت کو جاروب کش اور آیا سے لے کر ہیڈ نرس تک سب ہی جان گئے ہیں کہ وہ مریضہ ڈاکٹروں کی منہ چڑھی ہے اور پھر یوں بھی وہ سب ہی سے ہنس کر بات کرتی ہے۔ ہنسنا اس کی سرشت ہے اور بات کرنا اس کی فطرت ـــ

ادھر کچھ دنوں سے میں بھی اس میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اس کے شوہر سے ڈاکٹر منہاج کا اس دن کا سلوک کچھ عجیب سا لگا تھا بلکہ ایک حد تک تکلیف دہ۔

پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا سلام نہیں لیا تھا مجھے اچنبھا ہوا جب انھوں نے رعونت سے منہ پھیر لیا لیکن ان دنوں اس کی بیوی کی طبیعت زیادہ ہی خراب تھی۔ ڈاکٹر تن دہی سے اس کا علاج کر رہے تھے۔ اس کا شوہر بڑا پریشان تھا۔ سو نظر انداز کئے جانے کے بعد بھی میں نے اس کو ڈاکٹر منہاج کے پیچھے لپکتے ہوئے دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر نے جو اس کی بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ اسے بڑی بے رحمی سے جھڑک دیا ہے اور وہ اپنی بغل میں دبی ہوئی کتابیں مشکل سے گرنے سے بچا سکا ہے ـــ

مجھے اس شخص پر ترس آتا ہے جس سے میں اب تک دل ہی دل میں مرعوب رہا ہوں۔ وہ اپنی ساری کتابیں جلا کیوں نہیں دیتا۔ سنا ہے وہ بڑا نامی ادیب ہے ـــ لیکن یہ بھی سنا ہے کہ وہ کسی دفتر کا کلرک بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ کلرک بڑا ہے اور ادیب بہت چھوٹا بلکہ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ کوئی کلرک کسی ادیب کو اپنے اندر زندہ رہنے نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود میں اس سے مرعوب کیوں ہوں۔

ابھی ابھی ایک وارڈ بائے پورٹی کو کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا تو میں نے اس کو روک کر اس جلد بازی کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب میں ایک راشن کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ وہ لوگ بھول گئے ہیں جو ابھی ابھی بوڈی کیریر میں لاش لے گئے ہیں اور وہ لاش لے جانے والوں کے پیچھے بھاگا جو شاید فوری سواری نہ ملنے سے موریچری کی طرف چلے گئے تھے۔

میرا سر درد کرنے لگا ہے۔ ایک گولی نے بھی کچھ اثر نہیں کیا جسے کھائے بیس منٹ ہو چکے ہیں۔ گرم چائے کے لئے میں نے گیٹ تک چلے جانا ہی مناسب سمجھا ہے۔ ویسے کینٹین سامنے ہے۔ لیکن یہاں کی چائے مجھے کچھ بھاتی نہیں۔ لٹے بعض مناظر دیکھ کر تکلیف سی ہوتی ہے۔

ایک دن میرے ساتھ یہی تو ہوا تھا۔ میرے ساتھ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ بس میں ہی ہر چیز میں انسانی قدریں ڈھونڈنے کا بیوقوفی کی حد تک جو عادی ہوں۔ اس مریض لڑکے کو میں جانتا تھا اور جانتا اس طرح تھا کہ مہارانی صندل سوپ۔ رمی بیسنٹ، پر فیومڈ آئی برو پنسل اور اسمگل کی ہوئی فرنچ لپ اسٹک کا تحفہ اپنی چہیتی نرس کو دینے کے بعد وہ یک لخت بھول گیا کہ اس نے یہ چیزیں نرس کو دے دی ہیں اور نہا دھو کر حمام سے آیا تو لگا شور و غل مچانے کہ اس کی چیزیں کھو گئیں۔ اس کی محبوبہ دل نواز اپنی ڈیوٹی ختم کر کے مفٹی (MUFTI) زیب تن کئے نکلنے والی تھی کہ اس کو اس شور و غل کا پتہ چلا۔ وہ نرسس کواٹر سے دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے اپنے عاشق لڑکے کو ڈانٹا۔

" وہاٹ اے سلی چیپ یو۔ آر (کتنے نا سمجھ لڑکے ہو تم) بے ضرورت چیخ پکار کر رہے ہو۔ تم نے وہ چیزیں مجھے دے دی ہیں۔"

" کب دے دی ہیں۔" مریض عاشق نے ہنس کر خفت مٹاتے ہوئے پوچھا۔

" کیوں دی ہیں۔" اب تم مجھ سے یہ بھی پوچھو گے۔

وہ بالکل جھینپ گیا۔ اور پالتو کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ وہ دم جو اس کی نہ تھی اور جو ہوتی تو ہلتی ہوئی صاف طور پر نظر آتی۔

اور جب نرس مریض عاشق کو دوائی کے بجائے ڈانٹ پلاکر نکلی تو کین ٹن بین نئے ڈاکٹر کے استھسکوپ سے اسی کے دل کا معائنہ مسکرا مسکرا کر کر رہی تھی۔ اس ڈاکٹر نے کالج سے حال ہی میں ڈگری لی تھی اور پریکٹیکل ٹریننگ کے لئے یہاں متعین کیا گیا تھا۔ کیک پیسٹری کھارے بسکٹ اور گول ٹرا سپاٹ کا بل ادا کرنے کے بعد اس نرس نے ادائے دلبری سے اپنی سیٹ سے اچھل کر پھر استھسکوپ ڈاکٹر سے جھپٹ لیا اور اس کے دل کا پھر سے معائنہ کرنے لگی۔

"تمہارا دل نارمل ہے۔ کین ٹن کے بل کا ابھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی اور ڈاکٹر نے ادھر ادھر دیکھ کر پارٹیشن کا دروازہ برابر کر لیا اور یہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا لیکن کچھ ہی ثانیوں بعد اسپرنگ کی خرابی کے سبب دروازہ پھر کھلا تو نرس اور ڈاکٹر تڑپ کر جدا ہونے لگے تو نرس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "مجھے یہ سینٹ لا دو نا۔ یہ میرا فیورٹ ہے۔"

"لیکن تم نے یہ کس سے وصول کیا ہے؟" ڈاکٹر نے شرارتاً پوچھا۔

"کیوں — یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے اور تم حسد میں جل گئے۔"

"ڈونٹ وری ہارٹی — وہ بچارہ بڑا بے ضرر ہے — مریض لور — یعنی یعنی پیشینٹ عاشق کسی طرح بھی تمہارا رقیب نہیں ہو سکتا۔ دیکھو! اس نے کتنی ساری چیزیں مجھے دی ہیں۔ پور بائے!"

اب میں ان باتوں سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ آنسوؤں کے بالکل برابر قہقہے رکھے جا سکتے ہیں۔ کسی مرنے والے کے بستر کے بالکل پاس بیٹھ کر فلمی گیت گنگنایا جا سکتا ہے۔ جس میں یا ہو کی آواز ذرا دب گئی ہو۔ لاش لے جانے والی بند کیریر کے برابر سے کوئی منچلا سیٹی بجاتا ہوا بہ آسانی گذر سکتا ہے۔ مہکتے زخموں کو پوڈر اور سینٹ کی خوشبو یہاں اس قدر آسانی سے چھپا سکتی ہے کہ خون کے دھبے گلاب کے سرخ پھولوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ جن پر بیتتی ہے ہیبت جاتی ہے اور جنھیں خبر نہیں ہے سو بہر حال نہیں ہوتی۔ یہاں ہر سکون ہر بے اطمینانی کے منھ پر تھوک کر گزر جاتا ہے۔ یہاں غم اور خوشی کی سرحدوں کے درمیان اتنا لمبا فاصلہ ہے کہ دونوں سرحدوں پر کھڑے ہوئے آدمی نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں

نہ ایک دوسرے کی آواز ہی سن سکتے ہیں۔

اور اس ماحول میں معمول کے مطابق میں رات کی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ آج دو مریض صحت پاکر میرے ہاتھوں ڈسچارج ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک میرا دوست تھا۔ اس نے جاتے ہوئے جاپان کا ایک خوبصورت سگریٹ کیس مجھے تحفتاً دیا تھا جس میں لائیٹر فکس تھا۔ اور جس میں آٹھ گولڈ فلیک سگریٹ تھے۔ میں اسی کا سگریٹ اسی کے لائیٹر سے جلا رہا تھا کہ بے ہوشی کے عالم میں آؤٹ پیشنٹ سیکشن سے ایک کیس داخلہ کے لیے لایا گیا۔ اس شخص نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جو ہنس مکھ مریضہ کا کبھی نہ مسکرانے والا صحت مند شوہر تھا جو پابندی سے دواخانہ آتا تھا جس سے میں دل ہی دل میں مرعوب تھا، جس کو میں نے ڈاکٹر منہاج کے سلوک پر چھپ کر روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

دوسرے دن خبر ملی کہ وہ بچ گیا ہے۔ میں نے کوئی خوشی محسوس نہ کی۔

بند کیرتر میں کوئی لاش بجانے لگی تو میں نے بے دلی سے فوتی صداقت نامہ چاک کر دیا۔

جھنجھلا کر جب میں نے صداقت نامے پر لکھے ہوئے مرحوم کے نام کو قلم زد کیا اور صحیح نام لکھا تو کاٹا ہوا نام اس شخص کا تھا جس نے کل نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔

رفعت نواز

وہ بات

اوائل جولائی کی نیم خنک چاندنی رات تھی۔ آدھی رات تک تو دوستوں کے ساتھ گپ بازی ہوتی رہی تھی پھر ایک ڈیڑھ گھنٹہ ناول پڑھنے میں گزر گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی کوئی دروازہ کو لکڑی سے مسلسل پیٹ رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں بھی آدمی کو گہری نیند سے جگا دیا جائے تو جھلا جاتا ہے۔ اور میں تو اس معاملے میں اور بھی عجیب ہوں۔ میں نے قدرے چڑ کر پوچھا

"کون ہے ؟"

"دروازہ کھولو رضی، میں حامد ہوں!" حامد صاحب کی آواز گھگھیائی ہوئی تھی

"خیریت تو ہے"

"غضب ہو گیا میاں! تمہاری بچی گھر چھوڑ کر نکل گئیں"

"ہائیں! کب؟ کیسے؟ شام تک تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا!"

"بس تمہارے جانے کے بعد یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ مجھے تمہاری چچی کی کنجوسی بہت بری لگتی ہے اب یہی دیکھو نا تمھیں کھانے پر بلایا تھا تو تمھیں اچھا کھانا کھلاتی، خوب سا میٹھا کھلاتی۔ مگر وہ مہمانوں کو بھی ناپ تول کر کھلاتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے باز پرس کی تو زبان درازی کرنے لگی میں نے بھی چٹیا پکڑ کر دو چار طمانچے جڑ دیئے۔ بس ٹھسر ٹھسر رونے اور مجھے کوسنے لگی۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ اب اٹھ کر جو دیکھتا ہوں تو بیگم غائب"!

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہیں محلے میں کسی کے یہاں ناراض ہو کر چلی گئی ہوگی

صبح مناکر چچی کو لے آؤں گا۔"

"نہیں بھائی۔ ابھی پاس پڑوس کے گھروں میں اسے دیکھ آؤ۔ نہ معلوم بیگم کیا کر بیٹھے،
اس کا غصہ بڑا خراب ہے۔ اس سے پہلے ایک بار غصہ میں آئیوڈین کے دھوکے میں کوئی دوا پی لی تھی
حامد صاحب غم زدہ لہجے میں بولے۔

"حامد صاحب آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا اتنے معمولی سے جھگڑے پر چچی اتنا بڑا
اقدام کریں گی؟"

"تم کو معلوم نہیں ہے میاں، تمھاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے نا۔ تم کیا جانو ازدواجی زندگی کے رمز"
مکان میں جاکر اماں سے چچی کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مکان کا ایک ایک
کمرہ چھان مارا۔ محلے کے چار پانچ ملاقاتیوں کے یہاں چچی کو پوچھ آیا، چچی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب تو مجھے
بھی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ حامد صاحب کی حالت غیر ہو رہی تھی، ان کا چہرہ پسینے پسینے ہو رہا تھا
سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"صبح چوک جاکر ملنے والوں کے یہاں چچی کو دیکھ آئیں گے۔ چاندنی رات ہے ہو سکتا ہے خانصاحب
یا ہاشمی صاحب کے یہاں چلی گئی ہوں۔"

میں نے حامد صاحب کی دلجوئی کے لیے کہہ تو دیا مگر ایک انجانے خوف سے میرا دل بھی دھڑک رہا تھا

"چلو میاں محلے کی باولیاں جھانک آئیں۔"

"اس وقت کہاں باولیاں جھانکتے پھریں گے۔ آپ جاکر آرام کریں۔ صبح چچی کو آپ کے پاس نہ پہنچا
دوں تو میرا نام رضی نہیں۔" میں نے پینترا بدلا۔

"تم نہیں چلنا چاہتے تو مت چلو۔ میں ہی جاتا ہوں۔" حامد صاحب نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ کسی کا کہا مانتے نہیں۔ آپ کی اسی ضد کی وجہ سے چچی روٹھ کر چلی گئیں۔" میں نے ذرا چڑ کر کہا۔

"میں تمھاری نصیحت سننے نہیں آیا ہوں، کیا تم سمجھتے ہو تمھاری امداد کے بغیر میں بیوی کو نہیں
ڈھونڈ سکتا؟ پولیس میں نوکری کی ہے میاں بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ تم جیسے لونڈوں کو تو جیب میں

لئے پھرتا ہوں" حامد صاحب نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے گئے۔
مجھے معلوم تھا کہ حامد صاحب اتنی رات کو کیلے بیچی کو ڈھونڈنے نہیں جائیں گے، جا کر پلنگ پر لیٹ جائیں گے اور مجھے گالیاں دیتے رہیں گے۔ صبح جا کر میں انھیں مناؤں گا تو تھوڑی دیر تک وہ منھ پھلائے بیٹھے رہیں گے پھر ایک دم اٹھ کر مجھے گلے لگا کر پیشانی چومیں گے اور رو کر کہیں گے۔
"میرا منا بھیا کتنا اچھا ہے"
کوئی دس سال پہلے حامد صاحب ہمارے مکان میں کرایہ دار بن کر آئے تھے۔ ان دنوں وہ نئے نئے پنشن پر علیحدہ ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں مال اسباب خوب تھا۔ مکان چھوٹا سا تھا اس لئے سامان بے ترتیبی سے آنگن میں اور دالان میں پڑا رہتا تھا۔ انھیں اولاد نہیں تھی۔ بس دونوں میاں بیوی تمام دن پلنگوں پر لوٹتے رہتے تھے۔ دونوں تھے بھی خوب لحیم شحیم اور کاہل۔ انھوں نے ایک لڑکا ملازم رکھ لیا تھا جو سودا سلف لاتا تھا اور اکثر کھانا بھی پکا لیتا تھا۔ شوکت بڑا محنتی لڑکا تھا وہ دوڑ دوڑ کر جی لگا کر کام کیا کرتا تھا۔ اس لئے دونوں اسے بہت چاہتے تھے۔ میں ان دنوں نویں کلاس میں تھا اور حامد صاحب سے فارسی پڑھا کرتا تھا۔ میں جب بھی حامد صاحب کے یہاں جاتا انھیں نواڑ کے بڑے سے پلنگ پر لیٹا ہوا پاتا۔ پلنگ کی نواڑ ان کے وزن سے چرچراتی رہتی تھی۔ دوسرے پلنگ پر حامد صاحب کی بیوی لیٹی ہوتیں یا چولہے پر کچھ پکاتی ہوتیں۔ چولہے سے گز بھر دور کالا کتا بندھا ہوتا جو اپنی سرخ زبان سے قریب پھیلے برتنوں کو چاٹنے کی کوشش کیا کرتا اور اکثر اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ میں جا کر حامد صاحب کے پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ ادھر ادھر کی گپ لگتی۔ حامد صاحب اکثر پرانے قصے سنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان پر شعر سنانے کا دورہ پڑتا تھا۔ وہ فارسی شعر سنا کر مجھ سے ان اشعار کا مطلب پوچھا کرتے تھے۔ میں غلط سلط مطلب بتا دیتا تو چڑ جاتے اور جوش میں آ کر اٹھ بیٹھتے اور بتا دیتے غصے سے کہتے "تو ضرور استاد کا نام ڈبو دے گا"۔ پھر حامد صاحب تفصیل سے اشعار کا صحیح مطلب بتلاتے اور شاعر کے بارے میں بھی بتلاتے جاتے تھے۔ اس میں اکثر باتیں ان کے ذہن کی اختراع ہوتی تھیں۔

وہ جب اچھا کھانا کھاتے ہوئے ہوتے تو بیوی کو مخاطب کر کے اُردو اور فارسی کے عاشقانہ اشعار سنایا کرتے تھے۔ بیوی مصنوعی غصے سے کہتیں "ارے ہٹو جی یہ کیا چونچلے ہیں" حامد صاحب اور بھی ترنگ میں اگر شعر سنانے لگتے۔ بیوی شرمانے لگتیں اور کنکھیوں سے میاں کو دیکھتے ہوئے اپنا آپ چھپاتی رہتیں۔ اس وقت چچی کے چہرے پر بلا کا نکھار آجاتا۔ ان کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا اور ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر تک میاں بیوی، میری اور شوکت کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر واقعی چونچلے کیا کرتے تھے۔ ویسے چچی ابھی جوان تھیں۔ بال بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھیں۔ اس لئے جسم کسا ہوا تھا۔ چہرے پر کچھ قدرتی ملاحت بھی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوب بنی سنوری رہتی تھیں۔ چہرہ اسنو پاوڈر سے تھپا ہوا ہوتا۔ کپڑے چست پہنا کرتیں اور کپڑوں پر بھینی بھینی سگندھ والے عطر اور سینٹ لگایا کرتی تھیں۔ حامد صاحب سچ مچ چچی کے ناز اٹھاتے تھے۔ ہر دم چچی پر سے صدقے ہوا کرتے تھے۔ اردو اور فارسی کے رنگین اشعار چچی کو بھانڈوں کی طرح ایکٹنگ کر کے سنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تیج جات چچی کے منھ سے بھی نکل ہی جاتی "بڈھے میاں بس بھی کرو اب" بیوی حامد صاحب کو بڈھا کہتیں۔ تو وہ بے قابو ہو جاتے اور سینے پر دو تہتڑ مارنے لگتے اور خدا سے شکوہ کرنے لگتے کہ کیوں اس نے انھیں بڈھا کر دیا ہے

جب ادھر ادھر کی خوب باتیں ہو جاتیں تو حامد صاحب بیوی کی منت کرتے ہوئے کہتے "بی بی یہ غلام اور لونڈا تمھارے کرم کے منتظر ہیں، چائے تو پلا دو ہمیں"

چچی برا سا منھ بنا کر میری طرف دیکھتیں۔ پھر کھا جانے والی نظروں سے حامد صاحب کو دیکھتیں اور بڑبڑاتے ہوئے چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھا دیتیں۔ چائے بنتی، پھیکی اور نمکین حامد صاحب مزے لے لے کر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے جاتے اور چچی کی تعریف کرتے جاتے اور مجھ سے بھی ڈرا دھمکا کر چائے کی تعریف کروا لیتے تھے۔

اتوار کے دن میرا ناشتہ حامد صاحب کے یہاں ہوا کرتا۔ دو باسی چپاتیاں، باسی سالن تھوڑا سا اچار اور چائے کا ایک کپ اس دن میری ڈیوٹی چار گھنٹے کی ہو کرتی تھی۔

میں اور شوکت پلنگوں کی نواڑ کھینچتے، بازار جاکر ہفتے بھر کا سودا لاتے اور بڑی مسجد کے پیش امام کو بلالاتے۔ چچی کے پیٹ میں رسولی تھی، گولہ تھا یا جانے کیا بلا تھی کہ ان کا پیٹ حاملہ عورت کی طرح ابھرا ابھرا رہتا تھا۔ حامد صاحب سے کوئی بارہ برس پہلے کسی نے کہہ دیا تھا کہ چچی حاملہ ہیں اور ان پر جن کا سایہ پڑ گیا ہے جو بچے کی پیدائش میں مانع ہے۔ جب تک جن کا سایہ نہ ہٹے گا۔ بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ حامد صاحب پچھلے بارہ برس سے مختلف ملاؤں سیانوں اور سادھوؤں کے ذریعے چچی کا علاج کروا رہے تھے۔ مگر جن اتنا زبردست واقع ہوا تھا کہ کسی عمل سے زیر نہیں ہو رہا تھا۔ بڑی مسجد کے پیش امام صاحب ہر ہفتے آکر عمل کیا کرتے تھے۔ پانی دم کر کے چچی کو پلایا کرتے تھے۔ اور گنڈے تعویذ ان کے گلے میں باندھا کرتے تھے۔ دو بار ایسا بھی ہوا کہ عامل صاحب نے اعلان کر دیا کہ جن بھاگ گیا ہے۔ جلد ہی بچہ پیدا ہو جائے گا۔ اس خوشی میں ایک تقریب حامد صاحب کے یہاں ہو گئی۔ رات بھر ڈومنیاں گاتی رہیں ـــــ

حامد صاحب زچگی کا سودا لے آئے۔ محلے کی پرانی دائی کو نیوتا بھی دے آئے۔ بچے کے لئے جھولے کی تلاش ہونے لگی اور کتابیں دیکھ کر بچے کا کوئی نام بھی تجویز کیا جانے لگا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے ایک دن عامل صاحب پچھتائے کہ عمل میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ فلاں چیز بروقت نہ مل سکی تھی۔ لہٰذا پھر سے [illegible] شروع کرنا پڑے گا۔

ادھر کچھ دنوں سے حامد صاحب بیمار تھے۔ وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ مزاج میں چڑچڑا پن آگیا تھا۔ پیسوں کی تنگی بھی تھی اور بیوی کے زیور بکنے لگے تھے۔ اس لئے میاں بیوی میں اکثر چخ چخ ہوا کرتی تھی۔ ایسے برے وقت میں شوکت بھی نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ کسی ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلینر ہو گیا تھا اور ڈرائیور بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

میں ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ صبح ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے تھپکیاں دے رہی تھی۔ اور آنکھیں خود بخود مندی جا رہی تھیں۔

"ا بے رضی اٹھو صبح ہو گئی ہے"۔ حامد صاحب کی آواز تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا

جلدی جلدی منہ دھو کر باہر نکل آیا۔

"چلئے اب ڈھونڈتے ہیں چچی کو؟"

اندر سے اماں بولیں "حامد صاحب کو چائے تو پلاؤ بیٹے"

"میں گرم گرم چائے کا پیالہ لے آیا۔ حامد صاحب نے چار گھونٹ لئے اور بے دلی سے چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے "کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے" محلے بھر میں کہیں چچی نہ ملیں۔ پوری باولیاں بھی دیکھ لی گئیں۔ پھر شہر میں حامد صاحب کے ملنے والوں کے یہاں چچی کو تلاش کیا جانے لگا۔ خانصاحب کے یہاں تو حامد صاحب رو رو کر خان صاحب کی بیوی سے کہہ رہے تھے "بھابی ہاتھ جوڑتا ہوں۔ بیوی ہو تو میرے ساتھ کر دو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ اسے کبھی تکلیف نہ دوں گا۔"

خانصاحب کی بیوی نے قسمیں کھا کر حامد صاحب کو یقین دلایا کہ ان کی بیوی نہیں آئی ہیں۔ شام تک شہر بھر میں ہر ملنے والے کے یہاں چچی کو تلاش کیا گیا مگر ناکامی ہی ہوئی۔ حامد صاحب کا چہرہ اتر گیا تھا۔ سانس ہوے ہوے چل رہا تھا۔ اور ان کے قدم یوں پڑ رہے تھے جیسے اب اگلا قدم نہیں اٹھے گا۔ میرا بھی تھکن سے برا حال تھا۔ ہم دونوں افسردہ گھر پہنچے تو انور نے یہ خوش خبری دی کہ چچی حمیدہ دھوبن کے یہاں پناہ گزیں ہیں، دوڑے دوڑے حمیدہ کے گھر پہنچے۔ حامد صاحب مکان کے باہر ٹھہر گئے، اور مجھے اس ہدایت کے ساتھ چچی کے پاس بھجوایا کہ انھیں کسی طرح سمجھا کر منت حاجت کر کے لے آؤں۔ اندر چچی رو رو کر حامد صاحب کو کوس رہی تھیں اور ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھیں "بڈھا مارتا ہے موا، میں نہیں جاؤں گی۔ باہر سے حامد صاحب بیوی کی منت کر رہے تھے، معافیاں مانگ رہے تھے۔ اور آئندہ اچھے سلوک کا وعدہ کر رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے چچی راضی ہوئیں۔

گھر پہنچتے ہی حامد صاحب نے میری موجودگی میں ہی بیوی کو لپٹا لیا اور رو رو کے کہنے لگے "بیگم میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اگر نہ ملتیں تو میں مر گیا ہوتا اور

اس وقت تم میری لاش کے سرہانے بیٹھی ہوتیں۔ مگر مجھے مرکر بھی چین نہ آتا کہ میں نے تم سے معافی کیوں نہیں مانگی تھی۔"

اس واقعہ کے بعد کچھ دنوں تک حامد صاحب کے یہاں نہ جاسکا۔ اسی اثنا میں مجھے ملازمت مل گئی اور میری تعیناتی ایک تعلقہ پر ہوگئی۔ حامد صاحب کے یہاں خوشخبری سنانے گیا تو دیکھا کہ چچی حامد صاحب کے پیر دبا رہی ہیں اور سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی ہیں۔

کوئی چھ ماہ بعد وطن آیا تو معلوم ہوا کہ حامد صاحب بیمار ہیں۔ ملنے گیا تو وہ پلنگ پر لیٹے چھت کو گھور رہے تھے۔ چچی سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ گھر کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا اور قریب بلا کر مجھے گلے لگالیا اور رونے لگے۔ چچی نے گڑ کی چائے بنائی۔ چائے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں چچی اپنی معاشی بدحالی اور شوہر کی بیماری کا بکھان کرتی رہیں۔

دوسرے دن علی الصبح اماں نے جھنجھوڑ کر جگایا اور حامد صاحب کے انتقال کی دہشت ناک خبر سنائی۔ ایک لمحہ کے لئے لگا کہ میرا دل دھڑکتے دھڑکتے تھم سا گیا ہے۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دوڑا دوڑا حامد صاحب کے یہاں پہنچا۔ چچی پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ وہ بین کر رہی تھیں۔ بس وہ یک ٹک حامد صاحب کے مردہ جسم کو دیکھ رہی تھیں۔ محلے کی عورتیں آگئیں۔ ایک عورت نے انکی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ دوسری عورت نے ان کے گندھے ہوئے بال کھول دیئے۔ چچی نے ایک ہیبت ناک چیخ ماری اور بین کرنے لگیں۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں میرے سرتاج، آپ تو میرے بغیر نہیں رہ سکتے تھے نا۔ اب بتلایئے میں آپ کے بغیر زندہ کیسے رہ سکوں گی۔"

تجہیز و تکفین کے وقت شوکت پیش پیش تھا۔ سوم کے بعد وہ چچی کو اپنے یہاں لے کر چلا گیا۔ چوتھے روز میں بھی اپنی نوکری پر چلا آیا۔

سات ماہ بعد بہن کی شادی پر وطن پہنچا تو گھر میں چچی کا چرچا تھا، حشمت بی بولی

"میاں تمہاری چچی نے تو حامد میاں کی وفات کے بعد خوب گل کھلائے۔ اس نے شوکت سے نکاح کر لیا اور اب اس لونڈے کے ساتھ عیش کر رہی ہے۔ کم بخت کو ذرا بھی لاج نہ آئی۔ یہ سوانگ رچاتے ہوئے!" خبر واقعی تشویشناک تھی۔

چچی کے یہاں پہنچا تو لگا کہ میں حامد صاحب کی جوان بیوی کے یہاں نہیں آیا بلکہ کسی بھونڈ ڈھلتی عمر کی بھابی کے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ گھر کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ چچی گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھیں۔ سامنے بڑا سا پاندان کھلا پڑا تھا۔ میں نے سلام کیا تو انھوں نے اٹھ کر میری بلائیں لے ڈالیں۔ "رضی کیسے ہو، کب آئے، اب جلدی سے تم شادی کر لو، مجھے کتنا ارمان ہے تمہاری شادی کا۔"

میں نے رک رک کر ان سے نکاح کے بارے میں پوچھا تو وہ بڑے قوی لہجے میں بولیں "ان کے مرنے کے بعد میرا کون رہ گیا تھا۔ بیماری میں سب جمع پونجی ختم ہو گئی تھی۔ اگر شوکت نہ ہوتا تو آج سڑک پر بھیک مانگتی ہوتی جب شوکت نے پہلی بار نکاح کا کہا تھا تو میں بھی حیران ہوئی تھی۔ بہت دنوں تک سوچتی رہی۔ پاس پڑوس کی عورتوں سے مشورہ بھی کیا تھا۔ سب ہی نداق اڑاتی تھیں۔ لیکن جب شوکت اصرار کرنے لگا تو حالات دیکھتے ہوئے میں نے نکاح کر لیا۔ تم بتاؤ رضی کون سی برائی کی میں نے"۔ ....

چچی نے بڑے وقار سے میری طرف دیکھا۔

"چچی مزے میں تو گزر رہی ہے نا" میں نے پوچھا! "شوکت مارتا جلاتا تو نہیں"۔

چچی کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا سارے زمانے کے غم چچی کے چہرے پر سمٹ آئے۔ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولیں۔ خدا کی مہربانی ہے بڑے مزے میں گزر رہی ہے شوکت میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ چچی کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ انھوں نے منھ پھیر کر آنسو تو پونچھ ڈالے مگر ان کی آنکھیں اب بھی کسی گہرے کرب کا اظہار کر رہی تھیں۔

نایاب نسرین

تنہا تنہا

"بہت سی آوازیں تمہارا پیچھا کریں گی۔ بہت سے منظر تمہیں لبھائیں گے مگر تم مڑ کر مت دیکھنا ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے" دادی شاید کسی کو کہانی سنا رہی ہیں۔ یا یہ الفاظ یوں ہی میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

پر میں کیا کہوں؟ کیا بولوں؟ کیا چیخ کر کہہ دوں؟ چپ ہو جاؤ دادی، اتنے عرصہ سے تم یہ کہانی سنا رہی ہو۔ اب کیا فائدہ؟ لیکن الفاظ میرا ساتھ نہیں دے پاتے، اس لئے کہ میں نے مڑ کر دیکھ لیا ہے اور اب میں پتھر بن چکا ہوں۔

میں آج پورے اٹھارہ سال کا ہو گیا ہوں۔ آج ہی مجھے ابا نے بتایا ہے کہ انھوں لاہور کے ایک ہوسٹل میں میرے داخلے کے انتظامات مکمل کر لئے ہیں اور مجھے جلد ہی لاہور جانا ہوگا۔

میں اپنا تمام سامان سمیٹ رہا ہوں۔ میرا کمرہ کس قدر بے ترتیب ہے۔ جب سے اماں نہیں رہی ہیں تمام گھر ہی بے ترتیب ہو گیا ہے۔ دادی بوڑھی ہو گئی ہیں۔ وہ گھر کی اس قدر دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ اور دن رات میری چاند سی دلہن کی دعائیں مانگا کرتی ہیں! میں بچپن میں سوچا کرتا تھا کہ اماں مر جائیں گی تو بھلا میں کیسے جی سکوں گا، پر اماں کو مرے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں اور میں زندہ ہوں۔

ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر میں مجھے اپنا ایک پرانا رنگین ڈبہ مل گیا ہے اور

میری یادوں کی ڈور کھلتی جا رہی ہے، ہاں کبھی یہ ڈبہ مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ مجھے یاد ہے میں اسے رات کو سوتے وقت بھی ساتھ لے کر سوتا تھا۔ بچپن کی باتیں کس قدر احمقانہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت صحیح اور مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس وقت بھی خود کو اسی قدر بڑا اور عقلمند سمجھتا تھا، جیسا آج ہوں۔

اس ڈبے میں اماں کے جوتے کا چمکدار پھول ہے۔ رنگ برنگی چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔ کوڑیاں ہیں۔ گول تکونے پتھر ہیں اور ایک چار تہہ کیا ہوا پرچہ بھی ہے، جسے میں نے اماں کی نظروں سے چھپا کر سب سے نیچے رکھا تھا۔ پرچہ۔ پرچہ۔ پرچہ۔ کئی تاثر ذہن پر ابھر آئے ہیں۔ مختلف یادیں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔

مجھے یاد ہے یہ پھول اماں کے عید والے جوتے کا ہے، جسے ایک دن اماں نے ابا سے لڑنے کے بعد غصے سے توڑ کر پھینک دیا تھا۔ یہ کوڑیاں مجھے ابا نے لا کر دی تھیں۔ یہ اماں کی ان چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں جو کہ زیادہ تر میری مرمت کے دوران ٹوٹ جاتی تھیں۔

اور یہ پرچہ ——؟

مجھے یاد ہے وہ گرمی کی دوپہر تھی اماں اپنے کمرے میں بیٹھی بکس میں کچھ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ میں دور بیٹھا تھا، کیونکہ پاس جانے پر اکثر اماں ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ اس وقت اچانک ابا کسی کام سے اندر آ گئے تھے۔ اماں گھبرا سی گئی تھیں۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ اماں کو گھبرایا دیکھ کر ابا زیادہ گھبرا جایا کرتے تھے۔ اُس وقت بھی یہی ہوا تھا ابا گھبرا کر واپس لوٹ گئے۔ اور ان کے پیچھے ہی اماں بھی کمرے سے نکل گئی تھیں لیکن اُن کے بکس سے یہ پرچہ گر پڑا تھا اور جسے میں نے احتیاط سے اُٹھا کر اپنے ڈبہ میں چھپا دیا تھا۔ میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اس پرچہ میں ضرور کوئی عجیب سی بات ہے۔ جبھی تو اماں کئی روز تک کچھ تلاش کرتی رہی تھیں۔ اگر میں پوچھ لیتا تو جھڑک دیتیں۔ ایک دن اماں نے مجھے پاس بلا کر پیار سے پوچھا تھا۔

"بالے تجھے ایک پرچہ تو نہیں ملا ؟"

"کیسا ہے اماں ؟" میں نے تجسس سے پوچھا تھا۔

"ایسا ہی سفید سا کاغذ ہے، کیا تو نے دیکھا ہے ؟" اماں کے چہرے پر امید کی کرن جھلملاتی دیکھی تھی۔

"اس میں کیا لکھا ہے اماں ؟" میرے دھیان میں سفید کاغذ ابھر آیا۔

"سودے سلف کا حساب ہے اور کیا ہوتا ہے۔ کیا باپ کی طرح بال کی کھال نکالتا ہے تو بھی" اماں نے چڑ کر کہا تھا۔ میرا دل بجھ گیا۔ میں تو سمجھا تھا اس میں ضرور کوئی مزے دار بات ہوگی۔

اسی شام میں نے اپنے رنگین ڈبے کو گودام میں ڈال دیا تھا۔

آج میں پڑھ سکتا ہوں، وہ پرچہ پیڈ سے پھٹا ہوا ورق ہے۔ ورق کے بیچوں بیچ صرف چار سطریں لکھی ہوئی ہیں جن کے حروف مدھم پڑ چکے ہیں۔ لیکن میں انہیں پڑھ سکتا ہوں۔ میری نگاہیں حروف پر پھیل گئی ہیں۔ مدھم تحریر پر میری اماں کا چہرہ ابھر آیا ہے!

اماں ہر وقت اپنے ماحول سے بیزار نظر آیا کرتی تھیں۔ یوں وہ ہر کام بڑے سلیقے سے اور دل لگا کر کرتیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی ہر وقت خاموش رہتیں۔ بات بات پر بگڑ جاتیں۔ اور اکثر ان کا غصہ مجھ پر اترتا تھا۔ اس لیے میں زیادہ تر دادی کے پاس گھسا رہتا۔ دادی ہی میرا منہ ہاتھ دھلاتیں۔ وہی روٹی کھلاتیں۔ لیکن اماں مجھے رات کو ضرور اپنے پاس سلاتی تھیں۔ کبھی کبھی میری ضد پر کہانی بھی سنایا کرتی تھیں۔

جس دن اماں کا موڈ بگڑا ہوا ہوتا اس رات وہ مجھے ضرور قیدی شہزادی کی کہانی سناتیں۔

"بالے" وہ کہتیں۔ "ایک شہزادی تھی بہت پیاری سی اس کے ملک میں دور دیس سے ایک شہزادہ آیا۔

"اماں کیا وہ بہت خوبصورت تھا؟" میں بیچ میں سوال کرتا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتیں میں دوسرا سوال کر بیٹھتا، "کیا اس کے پاس سفید گھوڑا بھی تھا"۔

"ہاں۔ ہاں" اماں کہتیں "بیچ میں مت ٹوکا کر بابے! دیکھ تو میں کیسی پرانی کہانی کہہ رہی ہوں کہیں بھول نہ جاؤں۔ ہاں تو بابے شہزادی کو وہ شہزادہ بہت بھلا لگا۔ اور شہزادی نے سوچ لیا کہ وہ ہمیشہ شہزادے کی داسی بن کر زندگی گذار دے گی"۔

"اماں کیا داسی بننا بہت اچھا ہوتا ہے"۔ میں "داسی" کے معنی جانے بغیر سوال کرتا۔

"ہاں بہت اچھا۔ ایک اچھے انسان کے لئے انسان کیا نہیں کر سکتا۔ داسی بننا تو بہت معمولی بات ہے"۔ اماں اپنی کہانی جاری رکھتیں "پر وہ شہزادہ بہت رحم دل تھا۔ وہ غریبوں کو سکھ پہنچانا چاہتا تھا۔ جب اسے شہزادی کے ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے کہلا بھیجا۔ میری راہ بڑی کٹھن ہے۔ بتاؤ کہاں تک میرا ساتھ دے سکو گی"۔ یہاں آکر اماں ہمیشہ ٹھہر جاتیں۔

"آگے کہو اماں شہزادی نے کیا جواب دیا؟" میں ہزاروں دفعہ کا سنا ہوا جواب پھر سننا چاہتا۔

"شہزادی نے کہلا بھیجا جہاں تک تم چلو گے"۔

"اماں پھر شہزادے نے کیا کہا؟" میں ہمیشہ بیچ میں بول جاتا۔

"شہزادہ شہزادی کے جواب سے بہت خوش ہوا! اور اس نے کہلا بھیجا کہ میں بھی ملک ملک گھومنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا ہے۔ میری واپسی کا انتظار کرنا۔

"اماں شہزادے کا پیغام کیا تھا؟" میں پھر پوچھ بیٹھتا۔

"یہ تو ابھی نہیں سمجھے گا بالے۔ جب تو بڑا ہو گا تو میں تجھے بتاؤں گی، خیر تو شہزادی شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔ پر شہزادی کے ماں باپ بڑے ظالم تھے وہ شہزادی کی شادی کسی بڑے ملک کے امیر شہزادے سے کرنا چاہتے تھے۔"

"تو کیا شہزادہ امیر نہیں تھا؟" مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی۔

"نہیں، وہ کہتا تھا دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیئے۔ یہ کسی ایک کا حق نہیں ہے۔ وہ امیر تو تھا اس کے پاس اتنے بلند خیالات تھے، اونچے مقاصد تھے پر ایک دولت نہ تھی تو کیا ہوا۔"

"مگر اماں جس کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ تو غریب ہوتا ہے نا۔" میں اماں کو سمجھاتا۔

"نہیں بالے تو ابھی چھوٹا ہے۔ جب تو بڑا ہو گا تو تجھے پتہ چلے گا کہ علم و شعور کی دولت سے بڑی کوئی دولت نہیں۔"

اماں کی یہ ضد مجھے کبھی نہ بھاتی۔ اور گھنٹوں اماں سے بحث کرتا اور کبھی اس بات پر روٹھ بھی جاتا، مگر اماں پر میری ناراضگی کا اثر کم ہی ہوتا اور وہ بس کہانی سناتی رہتیں جیسے خود سے کہہ رہی ہوں۔ بعض اوقات تو مجھے لگتا کہ اماں پاگل ہیں۔

"بس پھر کیا تھا۔ شہزادی کو اس کے ماں باپ نے اندھے کنوئیں میں قید کر دیا۔"

میں نے اندھے آدمی تو دیکھے تھے پر اندھے کنوئیں کے نام پر میں ہمیشہ چونک پڑتا، اور کہانی کے اس اختتام پر ہمیشہ ابا کو اپنا زبردست قسم کا قہقہہ روکنا پڑتا۔

ابا کہتے "شانو تو کبھی یہ باتیں بھولے گی بھی۔"

بھلا کہانی بھی کوئی بھولا ہے۔ ابا کی ہر بات عجیب تھی۔ اماں ابا پر کتنا ہی بگڑتیں، پر ابا خاموش ہی رہتے۔ میں نے کبھی ابا کو اماں پر بگڑتے نہیں دیکھا۔

ابا مجھے بڑا پیار کرتے۔ اگر میرے چوٹ لگ جاتی تو ابا گھنٹوں مجھے گود میں لئے بیٹھے رہتے، لیکن اماں پلٹ کر بھی نہیں پوچھتی تھیں۔ نہ جانے اماں کیسی تھیں یہ میں کبھی سمجھ نہیں پایا۔ مگر مجھے یاد ہے مجھے ایک بار ابا نے ایک تھپڑ مارا تھا۔ اس دن اماں کا موڈ خراب تھا اور انھوں نے میری جی بھر کے پٹائی کی تھی۔ میں روتا ہوا دادی سے جا کر لپٹ گیا تھا۔ دادی نے کہا تھا "چڑیل کو معصوم بچے پر بھی ترس نہیں آتا۔ ڈائن نے میرے گھر کا سکون بھی برباد کر رکھا ہے۔" پھر دادی نے مجھے پیار کر کے اپنے پاس لٹا لیا تھا۔

اس روز میں دوپہر بھر عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا تھا۔ کبھی دیکھتا کہ اماں کے پاؤں پیچھے کو ہیں اور دانت بڑے بڑے کیونکہ میرے ذہن میں چڑیل کا تصور یہی کچھ تھا۔ کبھی دیکھتا کہ اماں مجھے دانت کھوے کھانے کو آ رہی ہیں۔ دن بھر دہشت ناک خواب دیکھنے کے بعد میں نے شام کو ابا کے پاس جا کر راز داری کے ساتھ کہا تھا "ابا اب میں تمہارے ساتھ جایا کروں گا۔ کیونکہ اماں تو ڈائن بھی ہیں اور چڑیل بھی۔" اور اسی وقت ابا کا ہاتھ بھرپور طور پر میرے منہ پر پڑا تھا۔

اس دن دادی رات گئے تک مجھے گود میں لٹائے نہ جانے کیا کیا کہتی رہی تھیں۔ دادی نے مجھ سے کہا تھا "تیری ماں کے من میں کیا ہے؟ یہ سب جانتی ہوں۔ پر تیرا باپ اس کا کیوں غلام ہو گیا ہے، یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ تو بھی نہیں سمجھ پائے گا۔ تو ابھی چھوٹا ہے بالے۔ پر میں تو ماں ہوں۔ بالے تیری ماں نے تو مجھ سے میرے بچے کو بھی چھین لیا ہے۔"

"بچہ کون دادی؟" میں نے ہمیشہ کی طرح ایک بے تکا سوال کیا تھا۔

"تیرا باپ اور کون!" دادی نے سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

اس وقت مجھے لگا کہ اس گھر میں سب ہی پاگل ہیں۔ بھلا دادی کو دیکھو اتنے بڑے ابا کو بچہ کہہ رہی تھیں۔

میں نے کبھی نہ دیکھا کہ اماں نے کبھی دادی سے ہنس کر بات کی ہو۔ دادی گیا وہ تو کبھی ابّا سے بھی زیادہ بات نہ کرتیں۔ چپ رہتیں۔ گم سم سی، اکیلی بیٹھی آپ ہی آپ مسکراتیں اور روتیں۔

اماں کو روتا دیکھ کر ہمیشہ ابّا ان کی دلجوئی کی کوشش کرتے۔ لیکن جب اماں آپ ہی آپ مسکراتیں تو اچانک ابا کا چہرہ پیلا ہو جاتا۔ جیسے کسی قیدی کو موت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔

بڑا عجیب وغریب ماحول تھا گھر کا۔ دادی گھر سے الگ الگ رہتیں۔ اماں بیزار نظر آتیں۔ سوائے ابّا کے جو ہر ایک کو اس کے درجے کے مطابق سمجھتے۔ اس عجیب ماحول سے گھبرا کر میرا گھر سے بھاگ جانے کو دل چاہتا۔ اور میں بھاگ بھی گیا ہوتا پر مجھے ابا سے پیار تھا۔ ابا کا پیار ایک ایسی نرم رو سبک ندی کے دھارے کی مانند تھا، جس کے بہاؤ پر انسان خود کو بے حد ہلکا محسوس کرتا ہے۔ ابا کی محبت کے آگے مجھے کبھی اماں کی محبت کی کمی کا احساس نہ ہوا۔ پر نہ جانے کیا بات تھی ہر وقت ایک تکلیف کا احساس ضرور طاری رہتا۔ دل چاہتا خوب چیخ چیخ کر روؤں۔

دادی کو ہر وقت میری فکر رہتی۔ کیونکہ بقول دادی کے میں روز بروز بگڑتا جا رہا تھا۔ ان ہی فکروں سے مجبور ہو کر دادی نے مجھے نیم والی بوا کے ہاں پڑھنے بٹھانے کا ارادہ کر لیا۔ نیم والی بوا کا گھر بھی ایک عجائب گھر تھا جہاں بھانت بھانت کے بچے جمع رہتے اور بے سری آوازوں میں سبق رٹتے رہتے۔ نیم والی بوا بچوں کو کتاب کی جھلک صرف ایک لمحے کو دکھاتیں۔ اور پھر دن بھر اپنا کام کرواتیں لیکن بچوں کو یہ تاکید تھی کہ سبق رٹنا ایک لمحہ کو بند نہ کریں

دادی کہتیں۔ "بڑی پکی پڑھائی ہے نیم والی بوا کی۔"

اس دن دادی نے بڑا اہتمام کیا۔ نیکر اور قمیض کے بجائے پاجامہ کرتا پہنایا تھا سر پہ ململ کی ٹوپی، آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، ہاتھ میں جزدان، جس کے اندر بغدادی

قاعدہ تھا۔ جب میں دادی کا ہاتھ پکڑ کر چلا تو اماں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

میرے اس حلیے کو دیکھ کر اماں ہنستے ہنستے بیدم ہو گئی تھیں۔

"تو تو مولوی ہو گیا ہے ہائے۔ بس اپنی بھی بخشش ہو گئی" اماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اور یہ سن کر دادی کے پتنگے لگ گئے تھے۔ اور پھر میں پڑھنے تو نہ جا سکا تھا۔ یہ دن گذرنے کا سامان ہو گیا تھا۔ دادی اور اماں دن بھر لڑتی رہتی تھیں۔

اور پھر ایک دن ابا نے مجھے اسکول میں داخل کر دیا۔

اسکول کے ماحول نے میری اکتاہٹ کو کسی حد تک دور کر دیا جو کہ مجھے اندر ہی اندر گھونٹے ڈالتی تھی۔

ماسٹر صاحب بہت اچھے تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے۔ غصہ کم کرتے تھے۔ لیکن جب کسی کو سبق یاد نہ ہوتا تو بری طرح پیٹ ڈالتے اور اپنے حسابوں سارا بدلہ چکا لیتے۔ گو ماسٹر صاحب نے مجھے کبھی سزا نہیں دی کیونکہ وہ ابا کے دوست تھے مگر پھر بھی مجھے ان سے نفرت تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ریاض کو بے تحاشا پیٹتے تھے۔

ریاض سے میری دوستی بڑی گہری تھی۔ پہلے دن جب میں جماعت میں ڈرا سہما سا داخل ہوا تو ریاض نے مجھے اپنی بنچ پر بٹھایا تھا۔ میری پنسل اپنے لال کٹر سے بنا کر دی تھی ریاض اکثر میری رائٹنگ کاپی پر بھی کام کر دیا کرتا۔ اس لئے مجھے ریاض بہت عزیز تھا۔ ریاض مجھ سے عمر میں بھی بڑا تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی لڑکا مجھے ستاتا نہیں تھا کیونکہ وہ جھگڑے چکانا خوب جانتا تھا۔

اس دن ماسٹر صاحب کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ہر بچے کی کاپی میں کسی غلطی کو تلاش کر کے بچے کی خاصی مرمت کر دیتے۔ لیکن جب ریاض کی باری آئی تو وہ کاپی ہی نہیں لایا تھا۔ ماسٹر صاحب کا غصہ ایک سو ایک ڈگری پر پہنچ گیا۔ اور انہوں نے ریاض پر گھونسوں، طمانچوں کی بارش کر دی۔

اس دن مجھے ماسٹر صاحب سے مکمل نفرت ہو گئی۔

رات کو اماں حسب معمول پلنگ پر خاموش لیٹی ہوئی تھیں۔ ابا کسی رسالے میں غرق تھے۔ اور میں نے موقع غنیمت جانا تھا۔

"اب میں اسکول میں نہیں پڑھوں گا۔" اماں خاموش لیٹی رہیں۔ جیسے وہ وہاں موجود نہ ہوں۔

"ماسٹر صاحب بہت برے ہیں۔ ریاض کو مارتے ہیں۔" میں نے دوبارہ اماں کو مخاطب کیا۔

"ریاض کو؟" اماں کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا۔

"ہاں ریاض کو۔ معمولی بات کتی پر۔" میں نے اماں کو متوجہ پا کر جوش سے کہنا شروع کیا۔

"ریاض تو بہت ذہین ہے نا؟" اماں نے میری بات سنے بغیر کہا۔

"ہاں بہت۔ سب سے زیادہ نمبر آتے ہیں اس کے۔ اس لئے تمام لڑکے جلتے ہیں اس سے۔" میں نے اماں کو بتایا۔

"تم تو نہیں جلتے؟" اماں کا سوال مجھے عجیب سا لگا۔

"میرا تو دوست ہے۔" میں نے اماں کو مطمئن کرنا چاہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے بابے! دوست ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے ایک دن تم بھی جلنے لگو گے۔"

میں نے دیکھا، ہوا سے رسالہ ابا کے ہاتھ میں کپکپا رہا تھا۔ ابا نے ایک دم پکارا

——"شانو۔"

اماں کہتی رہیں"بابے دوستوں کا کیا بھروسہ۔ یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ منزل کی لگن کدورت کو مٹا بھی دیتی ہے، بڑھا بھی دیتی ہے۔ کون جانے پل میں کون بچھڑ جائے۔ درمیان میں کتنے فاصلے ہوں۔ کتنی دوریاں۔" اماں کا گلا رندھ گیا۔

پھر اماں کروٹ لے کر لیٹ گئیں تو مجھے ایسا لگا جیسے اماں رو رہی ہوں۔ ابا خاموش لیٹے رہے۔ میں خوف زدہ ہو کر سو گیا۔

رات کو اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اندھیرے میں کوئی رو رہا ہے، میں نے خوف زدہ ہو کر پکارا "ابا"

ابا اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے دیکھا کہ ابا ابھی تک جاگ رہے تھے۔ کیونکہ سگریٹ ان کی انگلیوں میں جل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ سرخ ہو رہی تھیں۔

"ڈر گئے بیٹے؟"

"ابھی ابھی کوئی رو رہا تھا ابا!"

"نہیں تم صرف ڈر گئے ہو"

"شاید اماں رو رہی ہوں گی"

ابا نے پلٹ کر اماں کے پلنگ کی طرف دیکھا۔

"نہیں بابے تمہاری ماں تو بے خبر سوئی ہوئی ہیں"

میں نے ابا سے پوچھا "اماں ہر وقت روتی کیوں رہتی ہیں۔ ابا"

"نہیں تو، کہاں روتی ہے ماں تمہاری، اچھا اب سو جاؤ" ابا دوبارہ اپنے پلنگ کی طرف چلے گئے۔

صبح اُٹھا تو میں نے دیکھا کہ ابا کی آنکھیں سرخ تھیں۔ پلنگ کے نیچے سگرٹوں کے بہت سے ٹکڑے پڑے تھے۔ شاید ابا رات بھر جاگتے رہے تھے۔

ریاض میرا اتنا پکا دوست تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذکر بات بے بات کر بیٹھتا۔ اماں ہمیشہ ریاض کے ذکر پر بجھ سی جاتیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے اماں کی آنکھوں میں آنسو ہیں، اور ابا تو خاموش رہنے کے عادی تھے۔ کبھی کسی بات کا برا نہ مانتے۔ مانتے بھی تو زبان سے نہ کہتے۔ پر مجھے لگتا جیسے ابا بھی خوش نہیں ہیں۔ میری

سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ ریاض سے سب ہی جلتے۔ ماسٹر صاحب، اماں، ابا۔ تب مجھے یوں لگتا جیسے ریاض کوئی خوفناک چیز ہے۔

ان تمام باتوں نے مجھے اسکول سے بھی بیزار کر دیا۔ میرا اسکول میں بھی دل نہ لگتا یوں لگتا جیسے میرا دم گھٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گا۔ جب میرا ننھا سا دماغ زیادہ پریشان ہو اٹھتا تو میں دادی سے لپٹ کر بات بے بات رو پڑتا۔ دادی کہتیں۔ "بالے تو تو بالکل دیوانہ ہے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ ہی آپ رونے کی۔ تم سب لوگ تو مل کر مجھے پاگل بنا دو گے۔"

ایسی ہی ایک شام جب میں اکتایا ہوا تھا، گھر پر عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی، اماں جھنجھلائی ہوئی سی تھیں۔ ابا خاموش تھے۔ میں دادی کے گھٹنے سے لگا بے تکان بولے جا رہا تھا۔ خواہ مخواہ کی بے مقصد باتیں۔ اوٹ پٹانگ قصے۔

"یکایک ابا نے پکارا بالے!" عجیب سا لہجہ تھا ابا کا اس وقت۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ابا باہر جانے کے لئے تیار تھے۔ انھوں نے میری انگلی پکڑی اور باہر کی طرف چل پڑے۔

ہم کافی دیر تک گلیوں میں گھومتے رہے۔ ابا نے سارے رستے کوئی بات نہیں کی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابا کسی گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہیں۔ اس وقت ابا مجھے پہلے سے بھی زیادہ پراسرار نظر آ رہے تھے۔ اب ہم ندی کے پل پر سے گذر رہے تھے۔ آبادی ہم سے پیچھے رہ گئی تھی۔ پل سے چند قدم دور سینی ٹوریم کی عمارت تھی۔ یکایک ابا رک گئے۔ انھوں نے پل سے نیچے دیکھا۔ ندی ایک شور کرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ سورج مغرب میں ایک سرخ گولے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ خوفناک اور اداس، میں ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔

ابا بالکل خاموش تھے۔ میں اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سن رہا تھا۔ میں

نے خوف سے چھٹکارا پانے کے لئے کہا۔

"ابا کیا یہ ندی بہت گہری ہے؟"

ابا نے چونک کر دیکھا جیسے وہ میری موجودگی سے واقف نہیں تھے۔

"ہاں بہت گہری!"

"پر لگتی تو نہیں ہے ابا؟"

"بہت سی چیزوں کا صرف اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔" ابا پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ اور میرا دل پھر خوف سے لرزنے لگا۔

"ابا ہسپتال کا یہاں سے زیادہ فاصلہ تو نہ ہوگا؟"

"تو بھی کیا ہے۔ میلوں کے فاصلے تو پلک جھپکتے میں مٹ جاتے ہیں۔ پر دل کے فاصلے ...." آخری جملہ کہتے کہتے اچانک ابا کو میری موجودگی کا احساس ہوا' اور فوراً ہی بات بدل کر بولے۔ "پر بابے! یہ بتاؤ تم کو کس نے بتایا کہ ہمیں ہسپتال جانا ہے؟ کیا تمہاری ماں نے تم سے کہا؟؟" میں نے ابا کی آنکھوں میں حیرت اور رنج کی ملی جلی کیفیت دیکھی۔ اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔

"میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا ابا۔"

"اماں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا!!"

"نہیں ابا بھلا اماں مجھ سے کیوں کہتیں۔"

"اچھا!" ابا نے گہرا سانس لیا۔ "میں تمہیں بتاؤں بابے۔ ہمیں ابھی ہسپتال جانا ہے پر بابے اماں سے نہ کہنا۔ ورنہ تمہاری اماں خواہ مخواہ ناراض ہوں گی۔"

"کیوں...؟" پھر ابا نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدموں سے اسپتال کی طرف چل دیئے۔

سینٹ ڈریم کی بلند و بالا عمارت پر عجیب سی اداسی طاری تھی۔ سوگواری۔ بے کیفی

سفید وردیوں میں ملبوس نرسیں آہستگی اور خاموشی سے ادھر اُدھر آجا رہی تھیں۔
لیکن حسب عادت میں نے کسی چیز کو تجسس سے نہیں دیکھا۔ اور نہ قدم قدم پر ابا سے سوالات پوچھے کیونکہ ابا کسی گہرے سوچ میں گم تھے۔ میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرے ننھے سے ذہن میں صرف اس کا خیال تھا کہ جس سے اماں کو نفرت تھی، ابا اسے دیکھنے جا رہے تھے۔

وارڈ میں پہنچ کر ابا نے متجسس ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ وارڈ میں کافی بھیڑ تھی۔ مریضوں کے رشتے دار۔ دوست۔ عورتیں۔ بچے ان کی مزاج پرسی کیلئے آئے ہوئے تھے۔

ابا ایک پلنگ کے قریب جا کر رک گئے، جس پر ایک دبلا پتلا نحیف انسان لیٹا ہوا تھا اس کا رنگ گہرا سانولا تھا یا شاید بیماری نے ایسا کر دیا تھا۔

ابا نے آہستہ سے گلوگیر آواز میں پکارا "ریاض!"

مریض نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ عجیب سی آنکھیں تھیں۔ روشن اور چمکیلی۔ مجھے ان آنکھوں کو دیکھ کر جلتے ہوئے دو قمقمے یاد آگئے۔ روشن اور سفید۔

چہرے پر ایک جانی پہچانی کیفیت تھی۔ کوئی شکایت، کوئی سوگواری نہیں تھی۔ جو کہ ایسے مریض کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی یا ہوتی ہے۔

"مجھے یقین تھا تم آؤ گے!" آواز گہری اور صاف تھی۔

میں مریض کے حرکات و سکنات، بولنے کے انداز اور اس کے نحیف جسم اور اس قدر روشن آنکھوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ پر نہ جانے کیا بات تھی، جب ابا نے ہاتھ ملایا تو ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"تمہارا خط!" ابا نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ عجیب سا لہجہ تھا ابا کا۔ ایسا ہی جیسے میں غلطی کرنے کے بعد ابا کے سامنے اس کا اعتراف کرنا چاہتا اور نہ کر سکتا۔

"آج ہی ملا ہوگا؟"

"نہیں تین دن پہلے" ابا نے تصحیح کی۔ ایک طویل مدت بعد تمہارا خط ملا کہ تم وطن واپس

آگئے ہو۔ مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا مگر۔"

"پھر بھی تم اتنی ذمہ داریوں کے باوجود میرے پاس چلے آئے ہو۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" مریض نے پرشفقت اور مہربان لہجے میں کہا۔

"یہ کوئی شکریہ کی بات نہیں۔" ابا نے نرم آواز میں کہا۔ پھر دونوں یوں خاموش ہوگئے جیسے بات کرنے کے تمام موضوع ختم ہوگئے ہوں۔

"چچا کو سلام نہیں کیا تم نے۔" اچانک ابا نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔" اسے پہچانے ریاض!"

میں نے دیکھا کہ ایک لمحے کو مریض کے چہرے پر تاریکی کا بادل سا چھا گیا۔

"یہ تمہارا بچہ ہے؟ بھئی واہ۔ میں نے اتنی دیر کیوں نہیں دیکھا اسے! منے کیا نام ہے تمہارا؟" انھوں نے میرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر کہا' پتہ نہیں کیسا پیار تھا جو کہ ہاتھوں کے ذریعہ میرے دل میں اتر گیا۔

شدت جذبات سے میرا گلا رندھ گیا۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔" بالے۔"

"بالے! ارے!!" وہ ہنسے۔

"ہاں شاہد تو اس کو یہی کہتی ہے۔" ابا کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔ ایسی کھنک جو دوسروں کو مرعوب کر کے ہوتی ہے۔

میرے بازو پران کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر لیٹ گئے۔ ابا انھیں خالی خالی نظروں سے تکتے رہے' پھر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر جب ہم چلے تو وہ اسی طرح خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تھکے ہوئے اور کمزور نظر آرہے تھے۔

ابا راستے بھر خاموش رہے۔ پھر مجھے آج ابا کی پروا نہیں تھی۔ نہ ابا کی خاموشی نے مجھے ہراساں کیا۔ کیونکہ دو روشن آنکھیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ روشن اور چمکیلی۔ گھر کے نزدیک ابا رک گئے۔ انھوں نے اندھیرے میں مجھے دیکھنے کی کوشش کی

سنو بولے! ماں سے تو نہیں کہوگے کہ ہم ریاض کو دیکھنے گئے تھے"!
"نہیں ابا!" میں نے اقرار کیا۔
"ایک لفظ بھی نہیں! کیوں وعدہ رہا؟" ابا نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس سمے مجھے ایسا لگا جیسے میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں نے ابا کا ہاتھ تھام کر سنجیدگی سے کہا: "وعدہ!"

پھر نہ جانے کیسی تبدیلی آئی۔ میرا دل ہر وقت ایک مسرت سے ہمکنار رہتا دو روشن آنکھیں ہر وقت مجھے تکتے جاتیں۔ دو نرم ہاتھ میرے شانوں پر رکھے رہتے مسرت سنبھالے نہ سنبھلتی۔ دل چاہتا اتنے بڑے راز کو کسی سے کہہ دوں۔ پر ابا کے خوف سے ایسا نہ کر سکتا۔

ابا ہر شام میری انگلی پکڑ کر ریاض چچا کے پاس جاتے۔ ابا جتنی دیر تک باتیں کرتے رہتے، میں خاموش بیٹھا ریاض چچا کی متحرک آنکھوں اور بھیگی بھیگی مسکراہٹ کو تکا کرتا نہ جانے کیا بات تھی ریاض چچا کو دیکھ کر مجھے ایک سکون کا احساس ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے میرے من میں کوئی خلا تھا جو پر ہو گیا ہے۔

ریاض چچا میرے لئے روشنی کا مینار تھے۔ جن کو دیکھ مجھے اپنے سامنے ہر چیز بے حقیقت معلوم ہوتی۔ ریاض چچا میں ایسی کیا بات تھی کہ ابا ماں سے چھپ کر ان کے پاس جاتے اور میں ابا سے بھی چھپ کر۔ یہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میرا معمول ہو گیا تھا ہر روز اسکول ختم ہونے کے بعد میں ریاض چچا کے پاس پہنچ جاتا، جو میرا انتظار کر رہے ہوتے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی۔ میرا دل چاہتا کہ یہ آنکھیں ہمیشہ یوں ہی چمکتی رہیں۔ اور پھر میں ان کو اسکول کی بے مقصد باتیں سناتا رہتا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنا کرتے اور بیچ بیچ میں سوال بھی کرتے رہتے۔
"ریاض چچا! میرے دوست کا بھی نام ریاض ہے۔

"ارے!" انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ریاض بہت ذہین ہے۔ آپ بھی ذہین ہوں گے نا چچا؟"

"نہیں تو!" انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں آپ بھی ذہین ہوں گے۔ کیونکہ سب ریاض ذہین ہوتے ہیں۔" میں بضد ہو گیا۔

"وہ کیسے؟" انھوں نے دلچسپی سے دیکھا۔

"اماں کہتی ہیں، تمام ریاض ذہین ہوتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے۔

"ریاض تمہارا بہت اچھا دوست ہے نا بالے؟" انھوں نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

"پر اس سے کیا ہوتا ہے دوست ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔"

میرے ذہن میں اماں کا جملہ گونج اٹھا۔

"ارے کون بتاتا ہے، تمہیں یہ سب باتیں؟"

"اماں کہتی ہیں دوست ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔" میں نے انھیں اطلاع دی۔ وہ ایکدم زرد سے ہو گئے۔

"ریاض چچا!" میں نے سہم کر پکارا۔ "آپ کو کیا ہو گیا ہے چچا؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔ اچھا تم اب گھر جاؤ۔ ماں انتظار کرتی ہو گی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ نہ جانے ریاض چچا کیوں ناراض ہو گئے تھے؟

اماں کہتیں۔ "تو اب دیر سے کیوں آتا ہے بالے؟"

"اسکول میں بعد کو کھیل ہوتا ہو گا نا کیوں بالے؟" ابا سہارا دیتے۔

"ہاں ہاں ابا روز کھیل ہوتا ہے۔ پی ٹی۔ ماسٹر نہیں آنے دیتے۔" میں پنے ستیں ابا کو بہکا دیتا۔

"ہاں یہ تو ہے ہی۔" ابا کسی کتاب میں غرق ہو جاتے۔

جب میں شام کو ہسپتال جاتا تو ریاض چچا کبھی یہ ظاہر نہ کرتے کہ میں روز دوپہر کو ان کے پاس آتا ہوں۔ میں نے ریاض چچا کو کبھی نہیں کہا اور نہ ہی ریاض چچا نے کبھی اس کے متعلق بات کی۔ یہ ایک خاموش سمجھوتہ تھا جس کا پاس ہم دونوں کرتے تھے۔ پر اس شام میں نے ابا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ نہ جانے میری کس بات نے ریاض چچا کو ناراض کر دیا تھا۔ مارے دکھ کے مجھے کئی دن تک نیند نہیں آئی۔ میں سوچتا کہ ریاض چچا مان جائیں گے تو ابا کے ہاتھ مجھے بلوائیں گے۔ پر ریاض چچا اس قدر ناراض تھے کہ آٹھ دن گزرنے پر بھی انھوں نے مجھے نہیں بلایا تو میں خود ہی معافی مانگنے چل دیا۔

وہ سرخ کمبل میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ اُن کا نیلا چہرہ پہلے سے زیادہ نیلا ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے۔ پر ایسی مسکراہٹ جیسے کوئی آنسو ضبط کر کے مسکرائے۔ اُنھوں نے میرا ہاتھ تھاما وہ جل رہا تھا۔

"چچا آپ کو تو سخت بخار ہے"

"نہیں کوئی ایسا زیادہ نہیں"

"آپ نے دوا پی چچا؟" میں نے بزرگی طاری کی۔

"ہاں۔ ہاں بیٹے۔ پی لی"

"چچا" مجھے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی "میں ابا کی شکل نہیں ہوں نا؟"

"بھلا کون کہتا ہے؟"

"رات ابا دادی سے کہہ رہے تھے کہ بالا میری شکل سے بالکل نہیں ملتا۔ یہ کیا بات ہے" اور دادی نے کہا "شکل تو اس کی ہوگی جو من میں بسا ہوگا۔ پھر یہ تو خدا کے بھید ہیں"

"تمہاری ماں نے کیا کہا؟" اُنھوں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

"اماں تو ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ دادی کہتی ہیں کہ اماں تو بالکل پاگل ہیں" انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ماتھے پر ڈھیروں پانی کے

قطرے جمع تھے۔ میں چپکے سے اُٹھ کر چلا آیا۔ شاید ریاض چچا سو گئے تھے۔

رات کو ابا دیر سے گھر آئے۔ صبح اُٹھا تو میرے دل میں پھر وہی خلا موجود تھا جس کو ریاض چچا نے پر کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔؟

آج میں اسکول نہیں جانا چاہتا تھا۔ پر ہسپتال جانے کا وقت بھی تو نہ تھا۔ پتہ نہیں اس سے سب ہی اکتائے ہوئے تھے یا میرا ہی دل اُچاٹ تھا۔ لگتا تھا کہ ماسٹر صاحب اور جماعت کے تمام لڑکے وقت کی آہٹ پر کان لگائے بیٹھے ہیں۔

جب چوتھے پیریڈ میں چپراسی نے ابا کی آمد کی اطلاع دی تو میں یوں اُٹھ کھڑا ہوا جیسے کہ اس اطلاع کا منتظر تھا۔

ابا دروازے کا سہارا لئے کھڑے تھے ان کے بال پریشان تھے۔ چہرہ ایک دم پتلا ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے میری انگلی پکڑی اور ہسپتال کی طرف چل پڑے۔

وارڈ کے دروازے پر ابا ایک لمحے کو رک گئے۔ ریاض چچا کا پلنگ خالی تھا۔ میں نے ابا کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"صبح تمہارے ریاض چچا مر گئے بیٹے۔" ابا نے آہستگی سے سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئے۔ میں تڑپ کر رو دیا۔

میت اُٹھنے سے دفن تک کی تمام رسومات کو ابا نے بڑی خاموشی سے انجام دیا۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ ہسپتال کے لوگوں کے علاوہ صرف میں اور ابا تھے اور کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں ریاض چچا کے گھر والے کہاں تھے؟

جب ہم باہر نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ آج ابا کی چال میں عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ پل پر پہنچ کر ابا رک گئے۔ اُنھوں نے کوئی چیز نکالی میں نے دیکھا کہ یہ ریاض چچا کا البم تھا، جسے میں نے ایک دن انجانے میں اٹھا لیا تھا۔ اور ایک تصویر دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا تھا "ریاض چچا کیا یہ اماں کی تصویر ہے"؟

"کیا تیری ماں اب بھی ایسی ہی ہے بالے؟" چچا نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا تھا۔
آج وہی البم ابا کے ہاتھ میں تھا۔ ابا نے البم کھول کر ایک لمحے کے لئے دیکھا اور ندی میں پھینک دیا۔ اور پھر ابا پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔
پتہ نہیں کیوں اس سمے میری آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے۔ جیسے میرے رونے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں ابا کے جسم کو ہلتا ہوا دیکھتا رہا۔ میں سارے وقت خاموش تماشائی کی طرح رہا۔ پھر جب ابا نے اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے کر مجھے سینے سے لگایا تو میرے دل میں کوئی چیز چھنا کے سے ٹوٹ گئی۔ پتہ نہیں آج ابا کی آواز میں کیا چیز تھی؟ ایک عجیب سا رحم۔ بے بسی۔ جیسے ابا بہت دکھی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں!!
رات گہری ہو گئی ہم جب گھر کی طرف چلے تو ہمارے دل شکستہ تھے۔ اور میرے حلق میں آنسوؤں کی گھٹن تھی۔ ہم چل رہے تھے لیکن اندھیرے میں صرف ابا کی آواز اور قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔
"بالے آج ریاض مر گیا۔ پر مجھے لگتا ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔ اور خاموشی سے میرے ساتھ رواں دواں ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟۔ میں ریاض کو جب اس کی آخری آرام گاہ میں لٹا کر نکلا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے بچھڑا نہیں بلکہ میرے ساتھ ہے۔
مجھے خوف سے جھرجھری آ گئی۔
جس ریاض کو میں نے ایک عرصہ ہوا کھو دیا تھا آج اُسے پا کر بھی رنجیدہ ہوں۔ نہ جانے ایسا کیوں ہے؟ ملک ملک گھوما مگر بچپن کی کوئی بات بھلائی نہیں۔ اس کی یہی تو بات تھی کہ وہ ہر بات کو یاد رکھتا تھا، اور ہر تاثر اس کے ذہن پر جم کر رہ جاتا تھا!
ابا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے۔ پھر بڑی گھٹی ہوئی آواز میں بولے "مرنے والے کی زبان پر مسیحائی کی مہر ہوتی ہے۔ پر پتہ نہیں ریاض نے کہاں تک سچ کہا۔ شاید ٹھیک ہی ہو گا... تو تم میرے ہی بیٹے ہو نا بالے؟ ہیں!!

ارے یوں کیا تک رہے ہو؟" اُنھوں نے میری ٹھوڑی کو اُٹھایا۔

"ارے یہ ریاض کی آنکھوں کی سی چمک تم نے کہاں سے پائی؟"

نہ جانے ابا کیسی باتیں کر رہے تھے میں پھوٹ کر رو دیا۔

"ارے" وہ حیران رہ گئے "لو بھلا بتاؤ یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے؟ اچھا اب میں نہیں کہوں گا۔ تم تو میرے پیارے بیٹے ہو" ابا نے مجھے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔

"بالے" اُنھوں نے دکھ سے کہا "ماں کو مت بتانا کہ ریاض مر گیا ہے۔ ریاض تمہاری ماں کا بھی تو بچپن کا ساتھی تھا"

مجھے بڑا عجیب لگا۔ پہلے تو ابا کہتے تھے کہ ریاض صرف میرا دوست ہے پتہ نہیں ابا کی باتیں بھی بڑی عجیب ہوتی جا رہی تھیں۔ چلتے چلتے ابا نے پھر کہا "بالے آنکھ پونچھ لو۔ ورنہ ماں کو پتہ چل جائے گا"

اماں بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

"بالے کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ میں تو دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکی وہ تو دوسرے بچوں نے بتایا کہ تم اپنے ابا کے ساتھ چلے گئے ہو۔ آخر کہاں گھومتے رہے تم دونوں؟" اماں بولتے بولتے رک گئیں۔

آنسوؤں سے میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ ابا نے بولنا چاہا لیکن ان کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

اماں کی آنکھیں وحشت ناک طریقہ پر پھیل گئیں وہ جھپٹ کر ابا کے نزدیک آ گئیں۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ آخر کہاں تھے؟"

پر ابا اب بھی نہ بول سکے۔ اماں نے ابا کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "بولو۔ بولتے کیوں نہیں؟" ان کے بال اُن کی پشت پر بکھر گئے۔ ابا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

"بتاؤ۔ مجھے بتاؤ نا؟ تمہیں ریاض کی کوئی خبر ملی؟ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ۔ خدا

کیلئے مجھے بتاؤ۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں اب بھی چلی جاؤں گی۔ بولو۔ بولتے کیوں نہیں۔
اتنی دیر میں ابا نے دل گرفتہ آواز میں اماں کا بازو پکڑ کر کہا۔ "شانو! ضبط سے کام لے۔ ریاض ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

اماں نے ایک چیخ ماری اور ابا کے ہاتھوں میں جھول گئیں۔

اس کے بعد اماں کو میں نے پھر کبھی چلتے پھرتے نہیں دیکھا۔ بالکل پلنگ سے لگ گئی تھیں۔ میں سامنے جاتا تو اماں رونے لگتیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ اسی لئے میں زیادہ تر اماں کے سامنے نہ پڑتا۔ ابا ہر وقت اماں کے لئے دوائیں لانے اور دوائیں پلانے میں مصروف رہتے۔ ابا نے مجھے بالکل بھلا دیا تھا اور میں کونے کھدروں میں گھسا رہتا۔

پھر ایک دن ابا نے مجھے ماں کے پاس لاکر بٹھا دیا۔ اماں مجھے پیار کرتے رونے لگیں تو میں بھی رونے لگا۔

ابا نے کہا۔ "شانو سچ بتا بالے کی آنکھیں ریاض سے ملتی ہیں نا؟" اماں بھبک کر رو دیں۔

"تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو ظفر! وہ مقدس تھا وہ عظیم تھا۔ ظفر آخر تمہارے دل میں کیا ہے؟" اماں دیر تک روتی رہیں۔

پھر یوں ہی روتے سسکتے ایک دن چپکے سے مر گئیں۔

زندگی کے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی میں آج اماں کی کمی محسوس کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ اب ابا کی زندگی صرف میرے ہی گرد گھومتی ہے۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ہونٹوں پر سچائی کی مہر ہوتی ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک پرچہ ہے جس پر ریاض چچا کی اور اماں کی شبیہیں بن بن کر بگڑ رہی ہیں۔

باہر ابا کے قدموں کی چاپ ابھر رہی ہے اور۔ میں آدھا پتھر کا بن چکا ہوں۔

میں ابا کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ میں اس کمزور اور نحیف انسان کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتا، جس کی زندگی کا محور صرف میں ہوں۔

اب ابا نزدیک آگئے ہیں۔ یہ آخری لمحہ ہے۔ میں نے پرچہ کو جیب میں ٹھونس کر رنگین ڈبہ کو ایک بار پھر کباڑ میں پھینک دیا ہے۔

کبھی یہ رنگین ڈبہ میرے بچے کو ملے گا تو میں اُس کو بتاؤں گا کہ یہ میری اماں کے جوتے کے پھول ہیں۔ یہ میری ماں کی چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور میرا بچہ ان تمام چیزوں کو دلچسپی سے دیکھے گا۔

پر میں اس سفید پرچے کے بارے میں اس سے ایک لفظ نہیں کہوں گا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔

ن۔م۔ راشد

پیرو

تو مرے پیچھے، مرے قدموں پہ میلوں تک چلا
مجھ کو تیرے ہانپتے پاؤں کی ورزیدہ صدا آتی رہی
ایک مہجورِ ازل دل کی نوا آتی رہی

تو نے دوراہوں پہ آ کر لوٹ جانے کا ارادہ بھی کیا
ترکِ جادہ بھی کیا
پھر بھی تو چلتا رہا — چلتا رہا
میں تذبذب پر ترے ہنستا رہا — ہنستا رہا!

تو مرا سایہ ہے لیکن
تجھ کو سایہ بن کے رہنا ناگوار
ثانوی نسبت کا سہنا ناگوار
تو کبھی قامت کبھی   کی افزائش
کی سعیِ رائیگاں کرتا رہا

راہگیروں سے یہ دردِ دل بیاں کرتا رہا
مجھ کو یہ ڈر تو نہیں
ایک دن تو مجھ کو آ لے گا کہیں

سوچتا ہوں
تجھ سے پائے راہ پیمائی کے سارے حوصلے
میں گماں ہوں، میں گماں ہوں
اور تو میرا یقیں
میں تری صورت ہوں شاید
اور تو معنی مرا
میں ترا پیرو ہوں تو ہے رہبرِ دانا مرا
سوچتا ہوں
نقل لے لوں، اصل دے ڈالوں تجھے
اپنے جسم و روح میں "میں" کی طرح پالوں تجھے
ہاں اگر اندیشہ ہے دل میں تو یہ
پھر بھی رہ جائیں نہ باقی وہ نجومی فاصلے
میرے تیرے درمیاں جو سالہا قائم رہے
جن کا تو شاکی رہا
تو مرے پیچھے، مرے قدموں پہ میلوں تک چلا
چلتا رہا — دائم رہے چلنا ترا!

فارغ بخاری

خزاؤں کی بہار

بج رہی ہیں
موسموں کے اجڑے ایوانوں میں
بڑھتے فاصلوں کی گھنٹیاں
پھر زمیں کے
خشک سینے پر ہوا ہے شعلہ بار
برف کے ایندھن کا اندھا آبشار
زرد پتوں کے
سیہ لاشے اٹھائے
لالۂ و گل کے
چراغوں کو بجھائے
آ گئی ہے
کوہساروں
سبزہ زاروں میں
خزاؤں کی بہار

کرشن موہن

تیرا خیال

جیسے راہ سرد کو دے نافۂ آہو مہک
جیسے دشت تار کو دے دیدۂ آہو چمک
ایسے مہکاتا ہے، چمکاتا ہے قلب زار کو تیرا خیال
اے بت رنگیں جمال

تجدید

چڑھتا سورج، چمپئی کرنوں کی چھیڑ
اے محبت کی تڑپ
منجمد احساس کے بخیئے ادھیڑ
زندگی تجدید ہے
جیسے صبح نوبہار
مسکرائے، لہلہائے، جھوم اٹھے کوئی پیڑ

صغیر احمد صوفی

چاندی کا خدا

کچھ روز سے چاندی کا خدا شہر ہوس میں
کشکول سیاست لئے، کوچے میں گلی میں
تحصیل فراست کے لیے گھوم رہا تھا

محتاج تعارف تو نہ تھے، شہر کے عالم
کچھ اہل نظر، اہل قلم، دوش پہ ڈالے
حکمت کی، ذہانت کی، فراست کی قبائیں
چاندی کے خدا پر ہوئے جی جان سے شیدا
چاندی کا خدا ہاتھوں میں کشکول اٹھائے
محتاج بھکاری کی طرح گھوم رہا تھا
ہر اہل ہنر اس کے قدم چوم رہا تھا

پگھلا نہ مگر حلقۂ زنجیر تمنّا
چاندی کا خدا جیسے کہ پتھر کا صنم تھا

وہ گنبد اغراض و مقاصد میں پلا تھا
جب بھر چکا کشکول میں ہر فن کے نمونے
حکمت کے، فراست کے، ذہانت کے کھلونے
اک محفل مخصوص میں بولا کہ چلا میں
اس پار سمندر کی فضاؤں میں بہت دور

کرتے ہیں سبھی وعدۂ فردا پہ بھروسہ
یاد آتا ہے اس کا وہ پراسرار تبسم
اب اہل نظر، اہل قلم، شہر ہوس میں
اک حسرت تعمیر لئے سوچ رہے ہیں
کیا اس کا بگڑتا جو نہ جاتا کوئی دن اور

سید فضل المتین

حرف اوّل و آخر

یہ سورج
آگ کا گولہ
سوا نیزہ پہ ہوگا جب
یہ دھرتی
ایک لاوا بن کے جب بہتی ہوئی ہوگی
یہ جنگل راکھ ہوں گے جب
یہ پربت روئی کا گالا بنیں گے جب
سمندر اک دہکتی آگ میں تبدیل ہونگے جب
ہر اک شے جب وجود اپنا گنوا دے گی
تمھیں معلوم ہے ہم تم کہاں ہوں گے
فنا کی گود میں سوئے ہوئے ہوں گے
فنا ہی حرف اوّل ہے فنا ہی حرف آخر ہے

شہریار

ایک نظم

ابھی تو رنگ کی اڑان
سرحدِ نظر میں ہے
ابھی تو نور لازوال
دل کی رہ گذر میں ہے
ابھی تو روح بے قرار
جسم کے سفر میں ہے

ابھی سے آئینے تمام
ٹوٹ کر بکھر گئے
ابھی سے خوف کے مہیب
دیوتا بپھر گئے

ندا فاضلی

فضا خاموش ہے

بہت سے کام ہیں.....!!!

بنجر زمیں پر گھاس پھیلا دیں

درختوں کو اگائیں، ڈالیوں پر پھول مہکا دیں

پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں

چاند لٹکائیں

خلاؤں کے سروں پر نیلگوں آکاش پھیلا دیں

ستاروں کو کریں روشن

ہواؤں کو گتی دے دیں

پھدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغگی دے دیں

لبوں کو مسکراہٹ

انکھڑیوں کو روشنی دے دیں

سڑک پر ڈولتی پرچھائیوں کو زندگی دے دیں

فضا خاموش ہے.....!

تم آؤ تو تخلیق ہو دنیا

میں اتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

وقار خلیل

دو مختصر نظمیں

کل جو گھر تھا

ویرانہ ویرانہ سا ہے

خوف کا پروردہ یہ انساں

اس گھر کا مالک کہلائے

اور ذرا بھی شرم نہ آئے

●

اخباروں میں جو لکھا ہے

یوں لگتا ہے ہم سب کی تقدیر ہے گویا

آج کا انساں

کتنا بے بس کتنا الجھا الجھا سا ہے

ماضی کی تصویر نہ دیکھو

اب تو مستقبل کی سوچو

انتخاب سیّد

تجزیہ

ایک طرف
ڈستی ہوئی اژدہاؤں کی سرخ آنکھیں پیلے دانت
زہر میں ڈوبے ہوئے ناخن پہ
انساں کے لہو کی دھاریاں
دوسری جانب اندھیرا
دھند میں لپٹی، سسکتی، غم زدہ، مجبور پستی
کے نقوش
درمیاں
انسان کا بے نام وجود!
وقت کے بے رحم ہاتھوں میں اساس کائنات
سوچ کی پگڈنڈیوں پر

الجھنوں کی پھولتی سانسوں کا رقص
فکر و احساسات کے سہمے ہوئے
مرجھائے ہونٹوں پر
حیات و موت کی نیز ابیت کا ذائقہ
آرزوؤں کی ملائم پسلیوں پر
کش مکش کے بوجھ کا بھاری دباؤ
خواہشوں کی لاش بے گور و کفن
درد کے بنتے بگڑتے بلبلے
چیخ خود اپنی اسیر
کیا یہی ہے دیوتاؤں کی حسیں دنیا
ہماری کائنات ؟

کمار پاشی

مثبت رویّے کی مثال

عجب سرسراہٹ سی ہونے لگی ہے
مرے سر میں کوئی بلا رینگتی ہے
جو اب ریشہ ریشہ بکھرتی چلی جا رہی ہے
مرے خون میں زہر پھیلا رہی ہے
مرا سینہ جیسے پھٹا جا رہا ہے
کوئی لحظہ لحظہ مجھے کھا رہا ہے
عجب سرسراہٹ سی ہونے لگی ہے
مرے دل میں کوئی بلا رینگتی ہے
جو اب رفتہ رفتہ
مرے پیٹ کے سمت بڑھنے لگی ہے
کہ کچھ اور نیچے اترنے لگی ہے
میں پنجر ہوں اب
کھڑکھڑاتی ہوئی ہڈیوں کا
مگر وہ بلا
میرے چاروں طرف
اب بھی لپٹی ہوئی ہے
مجھے اک بھیانک سزا دے رہی ہے
کہ یوں زندگی کرنے کا حوصلہ دے رہی ہے

پریم وار برٹنی

انا اور اندیشہ

ترے ڈوب جانے سے کیا فرق پڑتا ہے مغرور سورج
ترے بعد میں ہوں
اجالے کی منزل
چراغِ غمِ دل
جو ہر دیر و کعبہ میں ہر رات جلتا ہے تنہا اکیلا
جو تو ڈوب جائے گا مغرور سورج
تو میں جل اٹھوں گا ترے بعد لیکن
اگر بجھ گیا میں
مجھے چھو گیا کوئی جھونکا ہوا کا
تو تاریک ہو جائے گا گھر خدا کا

رؤف خلش

نئی رتوں کا سفر

ہم ایسے نیند کے ماروں کو آج تک کچھ لوگ
تھپک تھپک کے سلاتے رہے زمانے سے
لہو میں گھل سی گئی تھی خمار کی لذت
کوئی بھی لہر نہ اٹھی لہو کے ساگر میں
کسے پتہ کہ امیدوں کی ریت سے ہم نے
نہ جانے کتنے گھروندے بنا کے توڑ دیئے
پھر ایک اجڑی ہوئی شام کا نشہ ٹوٹا
اچٹتی نیند کی مستی گنوائی آنکھوں سے
وفا کو ترک کیا، چھوڑ دی جبیں سائی
کہ دیوتا بھی تو پوجا سے خوش نہیں ہوتے
ہر آنکھ کھل گئی، جادو ستم کا ٹوٹ گیا
نئی رتوں کے سفر میں نکل پڑے ہم لوگ
کسی مسیح نے پونچھے نہ درد کے آنسو
کوئی نگاہ ملی بھی تو غیر بن کے ملی
ردائے شب کو جو الٹا تو کچھ نہ ہاتھ آیا
سنہری دھوپ میں ویرانی اپنے ساتھ رہی
یہ گردِ راہ بھی تھک سی گئی ہے کتنا چلیں
سفر کے نام پہ اب کتنی بار ہاتھ ملیں

علیم اللہ حالی

قطرہ کا مقدر

وہ ابھی
بس ابھی
عمر کی بیکراں ساعتوں
کے سمندر سے اچھلا تھا
اور ___ چاہتا تھا کہ
لہروں سے اوپر
تعلق کی زنجیر کو توڑ کر
اپنی ہستی کو اک شکل دے
جو وجود اس کو
پانی کی پورش نے بخشا۔ ابھی
وہ فضائیں اسے خود سنبھالے رکھے
پھر ابھی، بس ابھی
غیر محسوس ہاتھوں
نے قطرہ کو پھر
عمر کے بیکراں ساعتوں
کے سمندر میں گم کر دیا

رحمان فراز

تلاش

وہ طفلِ سادہ
جو دو برس پہلے شہر آیا تھا
اور انجان راستوں میں بچھڑ گیا تھا
میں روز و شب اس کو ڈھونڈتا ہوں
اجاڑ راتوں کے آنگنوں میں
خنک ہواؤں کی دستکوں میں
اداس کمروں میں، قہوہ خانوں میں
چپ دریچوں، دھواں اگلتی ہوئی بسوں میں
فسردہ راہوں، خموش گلیوں میں
بزمِ احباب میں، کبھی دل کی خلوتوں میں
میں اس کو ہر روز ڈھونڈتا ہوں
ہر ایک چہرے کو دیکھتا ہوں
خود اپنے سائے سے پوچھتا ہوں
وہ طفلِ سادہ کہیں ملا ہے؟

حیدر عمر شاداں

مآل

وہ شوخ کلیاں
جو شاخِ گُل پر
اُدا اُدا سے
لچک رہی تھیں
وہ شوخ کلیاں
جنھیں یقیں تھا
کہ ہم گلستاں کا مایۂ افتخار ہوں گے
مرے تمہارے
قدم کے نیچے
سسک رہی ہیں
بلک رہی ہیں!

نیائے شرما

نیائے شرما کی غزلیں پڑھی تھیں، افسانے پڑھے تھے، ریڈیو پر ایک گیت بھی اکثر سنتا رہا تھا لیکن ان سب کے باوجود جب میں بھائی مظفر (شاہجہاں پوری) صاحب کے ساتھ اُن سے ملنے جا رہا تھا تو بہت اشتیاق تھا اُن سے ملاقات کا اور نہ کوئی خاص عقیدت تھی اُن کے لئے۔ نیائے شرما اردو جانتے ہیں شعر کہتے ہیں اسلئے شعرا سے تعلقات ہوں گے۔ بھائی صاحب شاید اس لئے اُن سے ملانے لے جا رہے ہیں کہ ایک فلمی شخصیت سے مل کر میں اُن بہت سے لوگوں کی طرح خوش ہوں گا جو بمبئی کا سفر ناتمام سمجھتے ہیں اگر انھیں فلمی دنیا کی یا فلمی شخصیتوں کی جھلک نہ دکھائی دے۔

لیکن جیسے ہم نیائے شرما کے چھوٹے سے خوبصورت ڈرائنگ روم میں پہنچے اور شرما جی کو دیکھا تو پہلے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ یہ سادہ سی شخصیت فلم سے دور کا بھی تعلق رکھتی ہوگی۔ ایک بنیان اور سفید تہبند میں ایک وجیہہ انسان نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ باتیں کم ہوئیں۔ شاید اسلئے کہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن بعد کی ملاقاتوں سے معلوم ہوا کہ وہ زیادہ باتیں کرتے ہی نہیں۔ "شاہکار" کے پرانے مدّاح تھے اور خود انھوں نے یہ سوال کر کے کہ اس زمانے میں آپ کو ایسا ادبی رسالہ نکالنے کی کیا سوجھی۔ آپ کے اس ادبی ڈائجسٹ کو کون پڑھتا ہوگا؟ مجھے 'شاہکار' کے بارے میں اپنی بات کہنے کا موقع دے دیا۔

میں نے بتایا کہ واقعی اسکا ادبی معیار ہی اس کی ترقی میں مانع ہے۔ لوگ سستے تفریحی ادب کے شائق ہیں۔ ایجنٹوں کا مطالبہ ہے کہ اس میں کچھ جاسوسی کچھ فلمی اور کچھ جنسی افسانے اور مضامین ہوں۔ ادیبوں کی جگہ فلمی ستاروں کی تصویریں ہوں کیونکہ ایسے ہی رسالوں کی مانگ ہے۔

شرما جی غور سے سنتے رہے پھر انھوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لئے قطعی خلاف توقع تھا۔ شاہکار کے سلسلے میں مقروض ہوں اور 'شاہکار' ہنوز خسارے میں چل رہا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے مجھے سمجھایا کہ میں ہمت نہ ہاروں 'شاہکار' کا معیار نہ گراؤں ___ اور پھر انھوں نے گویا میرے سارے دکھ لے لئے "شاہکار کا سارا قرض اور خسارہ میرے ذمہ۔ آپ اس کی فکر چھوڑ دیں۔ میں صرف اتنا چاہوں گا کہ 'شاہکار' کا معیار گرے نہیں اور یہ صرف ادبی ڈائجسٹ رہے۔"

بمبئی کے جن دوستوں سے میں نے یہ ذکر کیا انھیں یہ سن کر حیرت ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ نیائے شرما کی ادب دوستی سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ وہ کم سخن ہونے کے ساتھ ساتھ

کم آمیز بھی تھے۔ فلمی دُنیا کی سرگرمیوں میں کم حصّہ لیتے تھے اور فلمی سیاست سے انھیں خاص دلچسپی نہ تھی۔ نہ انھیں شہرت کی طلب تھی نہ دولت کی ہوس۔ وہ بہت سادگی سے اور بہت خاموشی سے زندگی گذار رہے تھے۔

گذشتہ انتخابات کے ہنگامے شباب پر تھے۔ برادرم اقبال متین کے خط نے یہ وحشتناک خبر دی کہ نیائے شرما کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اس خبر پر یقین نہ آیا لیکن اخبارات نے اس کی تصدیق کر دی۔ پھر میں ماہنامہ "شمع" کا انتظار کرنے لگا کہ اس میں فلمی شخصیتوں کے متعلق تفصیل سے خبریں شایع کی جاتی ہیں لیکن اس میں بھی محض سرسری طور پر نیائے شرما کے انتقال کی خبر دی گئی تھی۔ نہ اُن کے حالات زندگی تھے نہ تصویر۔

یعنی نیائے شرما جیس سادگی سے زندگی گزار رہے تھے اُسی سادگی اور خاموشی سے دُنیا کو چھوڑ گئے۔

نیائے شرما کے بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں۔ اُن سے نہ زیادہ باتیں کرنے کا موقع ملا نہ اُنھوں نے اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ جو باتیں ہوئیں وہ بھی ادب کے بارے میں یا اردو کے بارے میں۔ اُنھیں افسوس تھا کہ پنجاب میں بھی اُردو ختم کی جا رہی ہے اور غصّہ تھا کہ اُردو والے اس کے لئے کوئی ایجی ٹیشن نہیں کرتے۔

اور آخری بار جب میں اُن سے رخصت ہو رہا تھا تو میرے دل میں اُن کے لئے بے پناہ عقیدت تھی اور اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ میں نے اُن کی اجازت کے بغیر اُن کا نام "شاہکار" کے سرپرست کی حیثیت سے شایع کر دیا۔

نیائے شرما کی بے وقت موت "شاہکار" کے لئے ذاتی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن میں اسے اُردو کے لئے ایک عظیم نقصان سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ جو شخص دور دراز سے جانے والے اُردو کے ایک خادم کی مشکلات سُن کر خود اعانت کی پیشکش کر سکتا ہو۔ اُس سے دوسرے اُردو والوں نے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس رازداری سے دوسروں کی مدد کرتے تھے، اسکی بنا پر اس کا اعتراف نہ کرنا بہت آسان ہے۔

نیائے شرما کی موت پر اُن کے پسماندگان کو صبر آجائے گا کہ وقت بڑے سے بڑے زخم کا مرہم بن جاتا ہے۔ دُنیا نیائے شرما کو بھول جائے گی کہ بڑے بڑوں کو بھول جاتی ہے لیکن میں ایسے مخلص، اتنے دردمند، ایسے بے لوث، ایسے نیک اور شریف انسان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ میری تو ہر سانس نیائے شرما کو خراجِ عقیدت پیش کرتی رہے گی اور میرے لئے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

محمود احمد ہنر

(علامہ) درد نکودری

نیائے شرما اور اُن کی شاعری

غزل اور نظم میں وہی فرق ہے جو انسانی دل و دماغ میں ہے۔ نظم اگر اردو شاعری کا دماغ ہے تو غزل اردو شاعری کے دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی اپنی جگہ دماغ اور دل دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ حقیقت بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ہماری ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے مسائل غزل کی نسبت نظم میں زیادہ وضاحت سے منتقل ہو سکتے ہیں۔ براہِ راست قسم کی شاعری میں بھی غزل کی نسبت نظم سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو غزل کو کئی اعتبار سے نظم پر فوقیت حاصل ہے۔ اختصار اور رمزیت کسی بھی ملک کی شاعری کے دو ایسے جوہر ہیں جو اعلیٰ اور عظیم شاعری کا جزو لاینفک کہے جا سکتے ہیں اور یہ دونوں جوہر زیادہ خوبصورت ڈھنگ سے غزل ہی میں بنتے ہیں۔ بلاشبہ غزل کا وجود فارسی ادب کا مرہون منت ہے۔ باقاعدہ صنف سخن کی حیثیت سے اس کی داغ بیل سب سے پہلے ایران ہی میں ڈالی گئی۔ اور ایرانی ادب سے یہ اردو ادب میں پہنچی۔ لیکن اردو ادب نے سالہا سال کی مشق اور کاوش کے بعد اسے کچھ اس طرح سے اپنا لیا کہ اب یہ صنفِ سخن نظم سے کہیں زیادہ ہمارے مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے ایک اور وصف کا ذکر بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھا غزل گو تو کامیاب نظم نگار ہو سکتا ہے لیکن کسی کامیاب نظم نگار کا اچھا غزل گو ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس مقام پر تو میں یہ کہنے کی جرأت بھی کروں گا کہ کم از کم اسلوب اور بیان کے اعتبار سے

تو کوئی بھی کامیاب غزل گو اچھے سے اچھے نظم نگار سے بہتر نظم نگار ثابت ہو سکتا ہے نظم کی افادیت
کا مجھے اعتراف ہے اور ذاتی طور پر میں نظم کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ
لب و لہجہ کی شستگی۔ الفاظ کی نشست و برخاست کی پختگی اور خیال کو زیادہ سے زیادہ موثر انداز
سے پیش کرنے کی شاعرانہ خوش سلیقگی کے لئے غزل کی مشق بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ازلی
اور ابدی صداقتوں اور ہمہ گیر آفاقی مشاہدوں کو دوسرے اصناف سخن کی نسبت غزل میں کہیں زیادہ
جامعیت اور جاذبیت کے ساتھ نظم کیا جا سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر غزلوں کے اشعار
ہی وقت کے ساتھ ساتھ ضرب المثال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن آج کل کے اکثر و بیشتر نوجوانوں کی غزلوں کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے۔ وہ غزل کی
سالہا سال کی قابل قدر روایات سے یک قلم منحرف ہو کر اپنی غزلوں کے رنگ محل تعمیر کرنے کی
کوشش کرتے ہیں لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے نتائج فکر کو پر لطف مہملات کے علاوہ کسی اور نام
سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ہاں کہنے کو نئی باتیں تو شاید ہوتی ہوں گی۔ لیکن کہنے کے
انداز سے وہ قطعی بے بہرہ ہوتے ہیں۔

خیال کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن اسلوب اگر ناقص اور کمزور ہو تو عمدہ سے عمدہ خیال بھی
اپنی معنویت کو کھو دیتا ہے۔ شاعری میں خیال اور اسلوب دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔
لیکن بیشتر جدید شعراء شعر کہتے ہوئے اس اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان
کے سماجی اور سیاسی شعور کی توانائی کے باوجود ان کے اشعار کے چہرے اترے ہوئے دکھائی
دیتے ہیں۔

نیائے ثریا سے میں کبھی نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے سن و سال کے لحاظ سے وہ نئے شاعروں
کی صف میں شامل نہ ہو سکتے ہوں۔ لیکن میں نے اردو شاعروں میں انکا نام تقسیم وطن کے بعد
دیکھا اور سنا ہے۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے انھیں نوجوان اور جدید شاعروں کے زمرے
میں سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ امر انتہائی طمانیت بخش ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں خیال کے ساتھ

ساتھ اسلوب کی قدر و قیمت کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ جو "گریۂ شبنم"
کے خوبصورت اور دل فریب نام سے منظر عام پر آرہا ہے میری نظر سے گزرا اور کئی غزلوں
کے کئی اشعار نے ان کی خوش ذوقی اور خوش فکری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور سب سے زیادہ
قابل قدر بات جو مجھے ان کی غزلوں میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ نیائے شرما اپنے عہد کے لاتعداد
نوجوان شاعروں کی طرح بے راہ روی کا شکار نہیں ہیں۔ غزل کی فنی روایتوں سے قطعی بے
نیاز نہیں ہیں۔ اپنے کئی اشعار میں اگرچہ انھوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے لیکن اس اجتہاد میں
بھی غزل کے بنیادی تقاضوں سے انحراف نہیں کیا۔ اپنی غزلیہ شاعری میں انھوں نے بالعموم اپنے
دل کی دھڑکنوں کو غزل کی روائتی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل عربی زبان کے مصدر مغازلت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عورتوں سے
نرم زبان میں محبت کی باتیں کرنا۔ اور فارسی زبان کے کسی شاعر نے بھی اس روشنی میں
غزل کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ؎

سخن نرم بازناں گفتن

موجودہ اردو غزل میں اگرچہ مضامین کے اعتبار سے بہت وسعت ہے، تصوف، فلسفہ،
اخلاقیات، مناظر فطرت، حب وطن اور سیاست غرضیکہ ہر قسم کے مضامین غزل میں ملتے ہیں
لیکن اس حقیقت کی تردید نہیں کی جاسکتی کہ غزل اپنے لغوی اور حقیقی معنوں سے کبھی دور نہیں
رہی اور عشقیہ جذبات کا عنصر ہمیشہ دوسرے عناصر سے زیادہ رہا ہے محبت ایک فطری جذبہ ہے
انسانی جبلت کا ایک ناگزیر تقاضا جو تہذیب انسانی کے کسی دور میں بھی پرانا اور فرسودہ نہیں
ہوسکتا۔ ہر دور میں کم و بیش ہر شاعر نے اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق محبت کو موضوع سخن بنایا
ہے۔ نیائے شرما کی غزلوں میں بھی عشقیہ شاعری کے کچھ جواہر ریزے ملتے ہیں جیسے ؎

زلف محبوب اگر بکھر جائے ـــــ رحمتوں کا سحاب ہوتی ہے
جان من! تم جس نظر میں آ گئے ـــــ وہ نظر بھی خوبصورت ہو گئی

ترے حسن نے گُل کھلائے ہیں کیا کیا — کہیں مصر بن کر کہیں طور ہو کر
اثر ہے یہ جذبِ محبت کا شاید — کھنچے آرہے ہیں وہ مجبور ہو کر
ہر آستاں پہ اس لئے ہے نہ سجدہ دل — شک یہ گزر رہا ہے ترا آستاں نہ ہو
اس ماہ رو کے حسن کی اللہ رے کشش — میری نظر گئی جو وہاں جا کے رہ گئی
خدا جانے کیا کہہ گئی وہ نظر — مگر لب نکلنے نے دعا ہو گیا

نیازِ ثریا کی شاعری کی مجموعی فضا غمناک بلکہ نمناک سی ہے۔ ایسا گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے آنسوؤں کی روشنائی سے شعروں کو لکھا ہے۔ اس اعتبار سے "گریۂ شبنم" کا نام انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے ؂

سب اہلِ دل، نیاز نزاکت کہاں ہے شبنم کی — ریاضِ دہر میں رونا کوئی ہنسی تو نہیں

بلاشبہ نیازِ ثریا کے غم میں شدت نہیں نزاکت ہے۔ ان کے شعروں میں غم کے شعلے نہیں لپکتے بلکہ غم کی ہلکی ہلکی آنچ محسوس ہوتی ہے لیکن اس ہلکی ہلکی آنچ نے ان شعروں میں بڑا تیز اور پائیدار تاثر پیدا کر دیا ہے جیسے ؂

غنچوں میں تازگی ہے نہ پھولوں میں جان ہے — فسردہ سی ہے صبحِ بہاراں ترے بغیر
خیال آ گیا کس کے روئے حسیں کا — چمکتا ہے ہر داغِ دل طور ہو کر
غم یہی ہے کہ آپ غم گیں ہیں — اپنے غم کا نہیں ملال مجھے
اک فقط اپنی بے بسی کے سوا — کون ہوتا ہے بے سہاروں کا
عمر بھر کا عہدِ الفت خوبصورت وہم ہے — دل سے ہوتا ہے مگر یہ وہم ہی مشکل سے دور
جب بھی سوتا ہے کوئی ہجر نصیب — ٹوٹ جاتا ہے دل ستاروں کا

اس غم نے ان کے شاعرانہ احساس کو لطافت عطا کی ہے۔ اسے اور تیکھا کر دیا ہے اور اب اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو حق بجانب ہیں ؂

غم کا ہلکا سا رنگ جس میں نہیں — وہ مسرت بہت ہی پھیکی ہے

اس غم نے ان کے دل و دماغ میں غم کی جو ہلکی سی خلش پیدا کی ہے وہی اس قسم کے شعر کی تخلیق کا محرک ہو سکتی ہے ۔

جس گلستاں میں کوئی خار نہیں
میرے نزدیک پر بہار نہیں

اور اس غم کی دھیمی دھیمی آنچ نے انھیں دنیا سے بیزار نہیں کیا بلکہ ان کے شعور کو وہ تابناکی عطا کی کہ وہ غم کی حیات پرور اہمیت کو ان الفاظ میں تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ۔

غم جسے وجہ شادمانی ہے
محرم راز زندگانی ہے

غم نے انھیں غیر معمولی طور پر حساس بنا دیا اور جیسا کہ ہر حساس آدمی کے ساتھ ہوتا ہے انھیں بھی بیشتر خود غرض اور ریاکار دوستوں سے دوچار ہونا پڑا ۔ دوستوں کے متعلق اپنے ناخوشگوار ردعمل کو انھوں نے اپنے کئی شعروں میں بیان کیا ہے جیسے ۔

مجھے مار ڈالا ہے گو دوستوں نے
مگر پھر بھی ان سے گلہ تو نہیں ہے

دوستو! کیا ہو گیا تم کو ہمیں ۔
زخم کھائے ایک مدت ہو گئی

مرے دشمنوں کا سلوک بھی جنھیں آج تک نہ دکھا سکا
غم زندگی کے وہ دن مجھے مرے دوستوں نے دکھا دیئے

مجھ کو اپنے رازداروں کی خوشی مقصود ہے
جس قدر چاہیں مرے احساس کو رسوا کریں

پہلے کی طرح پھر ساتھ آئے جب رنج و الم کی رات کٹی
اے صبح طرب! اب تو ہی بتا کب دوست ہمارے دور ہوئے

فریب دینے کے بارے میں آپ ہی جانیں
فریب کھانے کی عادت مگر بری تو نہیں

کس لئے چھیڑتے ہو زخموں کو
پوچھ کر حال میرے یاروں کا

ان کے شعروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دوستوں نے ان کو بہت سے فریب دیئے ہیں ان کا حساس دل بری طرح دکھایا ہے تاہم شرما صاحب کو اپنے دوستوں کا ممنون ہونا چاہیئے کیونکہ دوستوں کا رویہ اذیت ناک ہونے کے باوجود ان کی شاعری کے حق میں تو

کافی سود مند ثابت ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھیں اس قسم کے دوست نہ ملتے تو وہ مذکورہ بالا قسم کے دل گداز شعر کیونکر کہہ سکتے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ نیاے شرما اپنی روزمرہ زندگی میں نہایت پرہیزگار اور خدا پرست قسم کے انسان ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ اپنے اکثر اشعار میں وہ ایک رندلا ابالی کے لباس میں نظر آتے ہیں اور شراب کی نہایت رنگین اور لطیف کیفیتوں کے بارے میں ان کے ہاں نہایت وجد انگیز شعر ملتے ہیں۔ ان کے ایسے شعروں کو دیکھ کر بے اختیار ریاض خیر آبادی کی یاد آجاتی ہے۔ جنہوں نے عمر بھر شراب کو چھوا تک نہیں لیکن ایسی روح پرور رندانہ شاعری کی کہ بڑے بڑے بلانوش قسم کے شاعر عش عش کر اٹھیں۔ نیاے شرما کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن کا ایک ایک لفظ شراب ناب میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے جیسے ؎

جا گیر مل گئی ہمیں ساقی کے فیض سے ۔۔۔ ایک ایسی سرزمیں کہ جہاں آسماں نہ ہو

؟ ان مے فروش آنکھوں سے ایک بار پی تھی ۔۔۔ اس کے اثر سے اب تک میں لڑکھڑا رہا ہوں

کوئی جام آتشیں ساقی! عنایت ہو کہ ہم ۔۔۔ آگ ہی سے اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کریں

لوگ کہتے ہیں دختِ رز جس کو ۔۔۔ کشورِ بے خودی کی رانی ہے

اردو شاعری میں شیخ۔ زاہد یا واعظ کا ذکر اکثر ملتا ہے اور کئی شاعروں نے اس پر پھبتیاں کسی ہیں خاص طور پر رندانہ مزاج کے شاعروں نے تو اس غریب کی مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ در اصل یہ ہستی اردو شاعری میں ایک سمبل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایسے انسان کے سمبل کے طور پر جو ظاہری اعتبار سے تو انتہائی عبادت گزار اور خدا پرست ہے لیکن باطنی طور پر پرلے درجے کا ریاکار اور مفسدہ پرداز۔ اردو شاعروں نے اس ذات مبارک کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ تر اس کے قول و فعل کے تضاد ہی کو پیش کیا ہے۔ نیاے شرما کی رندانہ شاعری میں بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کے کافی نمونے ملتے ہیں جیسے ؎

ہر ایک سجدے میں ارمان حور و غلماں کا ۔۔۔ یہ اک طرح کی تجارت ہے بندگی تو نہیں

زاہد ترے خیال میں بیشک شراب ہے　　میری نظر میں کم نہیں آب حیات سے

ساغر میں بادہ کم ہے زیادہ گلاب ہے　　لے کر خدا کا نام اے زاہد چڑھا بھی جا

تبلیغ کافروں کی تو عینِ ثواب ہے　　ساقی! جناب شیخ کو بھی ایک آدھ جام

وہ رند جس پہ سایۂ پیر مغاں نہ ہو　　کیا حشر تا ابد رہے غرقِ گناہ زہد

مگر اس میں مے کا مزا تو نہیں ہے　　نہایت مقدس سہی آب کوثر

شراب اک دشمنِ جاں ہے ترے نزدیک اے واعظ
ہمیں یہ چیز تو غم کی دوا معلوم ہوتی ہے

لیکن جیسا کہ میں اوپر بھی ذکر کر چکا ہوں۔ نیاؔ ئے شرابِ ناب کے نہیں حرفِ بادۂ سخن کے متوالے ہیں۔ کرنے کو تو انھوں نے ہر رنگ کی شاعری کی ہے اور وہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ع

ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

اپنی غزلیہ شاعری کے آئینہ خانے میں وہ کہیں ایک حسن پرست اور عاشق مزاج اور کہیں ایک رندِ لاابالی کے لباس میں نظر آتے ہیں لیکن ان کی باطنی شخصیت کا اظہار دراصل ان شعروں میں ہوتا ہے جن میں وہ ایک مفکر کی طرح حیات و کائنات کے بوقلموں مسائل پر سوچتے ہیں اور سوچنے کی دعوت دیتے ہیں جہاں ان کا وجدان شعر عرفان کی بلندیوں سے ہم کنار معلوم ہوتا ہے اور جہاں ایک دردمند اور انسان دوست شاعر کی طرح غمِ ذات کو غمِ کائنات کے پس منظر میں دیکھ کر وہ ایسا شعر کہہ جاتے ہیں ؎

دشمن کے حال زار پہ بھی رو رہا ہوں میں　　یہ سوچ کر کہیں یہ مری داستاں نہ ہو

ان کے معنوی کردار کو ان کے اس قسم کے اشعار اجاگر کرتے ہیں جس میں وہ کچھ ماورائی حقیقتوں کو بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں جیسے ؎

جس طرف تم وہاں خدائی ہے　　جس طرف میں نہیں وہاں میں بھی

اب مجھے تیرا انتظار نہیں　　اب مجھے انتظار ہے اپنا

خوب صورت مری نظر ہے فقط　　کوئی جلوا تو خوش جمال نہیں

اگر انسان کا ذوق عبادت خوب صورت ہو

تو ہر مٹی کی سورت دیوتا معلوم ہوتی ہے

جسے تو حسن مجسم کا نام دیتا ہے　　کہیں یہ تیری نظر ہی کی دلکشی تو نہیں

نیائے شرما کی غزلوں میں متنوع موضوعات سے متعلق رنگا رنگ اشعار ملتے ہیں لیکن ہر قسم کے شعروں کے انداز بیان میں بے تکلفی اور برجستگی بدرجۂ اتم موجود ہے اپنے گوناگوں احساسات کو وہ نہایت سیدھے سادے عام فہم اور رواں دواں اسلوب سخن سے قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں زیادہ تر قریب النثر مصرعے اور شعر ملتے ہیں جیسے ؎

جس کا اظہار ہو نہیں سکتا　　ہم نے دل پر وہ چوٹ کھائی ہے

موت کا اعتبار ہو تو ہو　　زیست کا کوئی اعتبار نہیں

ایثار ہبر ہی جب نہیں کوئی　　گمرہی کا کوئی سوال نہیں

یہی حیات اگر ہے تو کیا حیات ہے یہ　　اگر یہی ہے زمانہ تو کیا زمانہ ہے

رہزنوں کا تو خیر کیا کہنا　　رہبروں کا بھی اعتبار نہیں

چھوٹی بحروں میں تو انھوں نے اپنی رنگینی طبع کے خاص طور پر بہت سے جوہر دکھائے ہیں۔ بعض شعروں کا لب ولہجہ داغ دہلوی کی یاد تازہ کر دیتا ہے جیسے ؎

شکایت آپ سے ہے میرے دل کو　　محبت بھی مگر ہے آپ ہی سے

رنگ و بو کا مآل ظاہر تھا　　خواہش رنگ و بو کیے نہ بنی

نیائے شرما ایک بلتے اور ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ایک فطری شاعر کے تمام اوصاف ان کے شعروں میں جھلکتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا کینوس بھی محدود نہیں ہے۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے نہایت چابک دستی اور ہنرمندی سے اپنے اشعار میں اظہار خیال کیا ہے ان کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں کا ذکر جس نے ن کے اشعار کی مثالوں کے ساتھ کر دیا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ان کی شاعری مجھے کافی خوشگوار اور مزہ دار معلوم ہوئی ہے اور اس میں مقبول خاص دعام ہونے کی خوبی موجود ہے۔ ان پہلوؤں کے علاوہ نگاہ نکتہ داں یقیناً خوبیوں کے کچھ اور پہلو بھی تلاش کرلے گی۔ اور اس کے برعکس نگاہ نکتہ چیں ان اشعار میں ممکن ہے کہ زبان و بیان کی کچھ لغزشیں بھی ڈھونڈ لے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ نیائے شرما کی شاعری بالکل بے عیب ہے ___ اس کے مطالعے سے نگاہ نکتہ چیں کو یقیناً قطعی مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن نیائے شرما کی شاعری کے متعلق یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ اول سے آخر تک ہے پر کیف۔ اور یہ وہ جوہر ہے جس سے نیائے شرما کے بے شمار ہم عصر جو بزعم خویش اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں، قطعاً محروم ہیں اور میرے نقطۂ نظر سے کسی شعر کا پر کیف ہونا اس کے بے عیب ہونے سے کہیں زیادہ لائق تحسین ہے۔

...... بندہ میرے نام سے پہلے لفظ 'پنڈت' نہ لکھیں۔ پچھلے تین برسوں سے زیادہ کا زمانہ گذرا ہے جب سے میں ہندوستان کی اس روحانی دھرتی میں پنڈتوں اور مولاناؤں کے کتنے ہی بھیانک ناٹک دیکھ چکا ہوں۔ کوئی زمانہ ہوگا جب میرے بزرگ اپنے نام کے ساتھ لفظ 'پنڈت' لگا دیکھ کر فخر سے سر بلند کرتے ہوں گے۔ مگر آج اپنے نام کے ساتھ اِس لفظ کو دیکھ کر میرے احساس کی تو آنکھیں جلتی ہیں۔ سرمد۔ نانک۔ اور کبیر کی اس سرزمین پر میں ایک انسان اور صرف ایک انسان کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا اور خود کو بہت ہی خوش نصیب سمجھوں گا اگر کوئی بھی دم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگوائے بغیر انسانیت کی امانت اپنے سینے میں صحیح سلامت لئے ہوئے زندگی کا سفر اس کی آخری منزل تک گزار سکوں۔"

نیائے شرما

(مدیر 'شاہکار' کے نام ایک خط میں)

نیائے شرما کی دو غزلیں

دل ایسے جاں نثار نے رسوا کیا ہمیں
اک مہ جبیں کے پیار نے رسوا کیا ہمیں

بدنام کب ہوئے ہیں بھلا میکشی سے ہم
غم ہائے روزگار نے رسوا کیا ہمیں

کچھ اپنی بادہ نوشیاں حد سے گزر گئیں
کچھ شیخ نابکار نے رسوا کیا ہمیں

معصومیوں کے جرم میں اے سادہ لوح دل
دنیائے فتنہ کار نے رسوا کیا ہمیں

رسوائی اپنے راز کی ممکن نہ تھی مگر
اپنے ہی راز دار نے رسوا کیا ہمیں

جس شوق کے لئے تھا بہت ضبطِ غم عزیز
اس شوق بیقرار نے رسوا کیا ہمیں

اپنا ہی ایک یار ہمیں تھا عزیز جاں
اپنے ہی ایک یار نے رسوا کیا ہمیں

اپنا شعار صرف تھا تلقین دوستی
لیکن اسی شعار نے رسوا کیا ہمیں

تقصیر وار صرف ہے اپنی ہی بیخودی
اپنے ہی انتظار نے رسوا کیا ہمیں

صہبا کے آسرے پر دنیا میں جی رہا ہوں
یہ مجھ کو پی رہی ہے میں اس کو پی رہا ہوں

جس کی ہر اک خطا پر قدرت بھی جھومتی ہے
روز ازل سے میں ہی وہ آدمی رہا ہوں

دنیا کو کیا خبر ہے ہنگامۂ جہاں میں
جی جی کے مر رہا ہوں مر مر کے جی رہا ہوں

یہ جنتیں جہاں کی جچتی نہیں نظر میں
ان بستیوں میں آخر میں بھی کبھی رہا ہوں

پہنچا ہے انتہا پر ضبطِ غم محبت
لب کب کے سی لئے تھے اب اشک پی رہا ہوں

احمد ندیم قاسمی

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھالوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا، مگر اے جرأت اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز سے سوچوں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں، جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار میں یا شہر خموشاں میں کھڑا ہوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشت مصیبت میں پکاروں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے، تو یارب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں

سید احتشام حسین

ڈر ڈر کے جیسے میں سن رہا ہوں
کھوئی ہوئی اپنی ہی صدا ہوں

جب آنکھ میں آ گئے ہیں آنسو
خود بزم طرب سے اٹھ گیا ہوں

چھٹتی نہیں خوئے حق شناسی
سقراط ہوں، زہر پی رہا ہوں

اپنی ہی ہوس تھی سر کشیدہ
دامن سے الجھ کے گر پڑا ہوں

عریانیٔ فکر کھل نہ جائے
خوابوں کے لباس سی رہا ہوں

ہر منزل مرگ آفریں میں
سرگشتۂ زندگی رہا ہوں

دھبے ہیں بہت سے تیرگی کے
کن روشنیوں میں گھر گیا ہوں

شیر افضل جعفری

اس کو اپنی ذات خدا کی ذات لگی ہے
میرے دل کو پاگل کی یہ بات لگی ہے

کلجگ ہے اور دکھڑوں کی برسات لگی ہے
نوح کی کشتی میرے گھر کے سات لگی ہے

میرے پاس تہی دستی ہے، درویشی ہے
یہ دولت کب شہزادوں کے ہات لگی ہے

گوری چٹی دھوپ نہ جوبن پر اترائے
دن کے پیچھے کالی کالی رات لگی ہے

ایک حسین فرعون کو بزم شعر و سخن میں
میری غزلوں کی پستک "تورات" لگی ہے

میں انسان کو موت کا دولہا کہہ دیتا ہوں
مجھ کو ماتم کی ٹولی بارات لگی ہے

مصطفیٰ زیدی

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی، دلِ شاہانہ چھٹ گیا

کوئی تو غمگسار تھا، کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھٹ گیا

دنیا تمام چھٹ گئی پیمانے کے لئے
وہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چھٹ گیا

کیا تیز پا تھے دن کی تمازت کے قافلے
ہاتھوں سے رشتۂ شبِ افسانہ چھٹ گیا

اک دن حساب ہوگا کہ دنیا کے واسطے
کن صاحبوں کا مسلکِ رندانہ چھٹ گیا

شمس الرحمٰن فاروقی

موجِ دریا کو پئیں، کیا غمِ خمیازہ کریں
رگِ افسردۂ صحرا میں لہو تازہ کریں

دل کے مجلس میں کریں ذات کا ماتم کب تک
آؤ باہر تو چلیں، وقت کا اندازہ کریں

خون ہے اک دولتِ دل، لوٹ ہی لیں اہلِ فلک
چہرۂ داغِ قمر پر تو نیا غازہ کریں

انگلیاں سرد ہیں پھونکیں تو انھیں جوش میں لائیں
اپنے سینوں پہ لکھیں، حرفِ وفا تازہ کریں

شیشہ تھا اک غمِ دل ٹوٹ کے ساحل پہ گرے
منتشر ریت کے ہر ذرے کا شیرازہ کریں

گرگِ احساس سے بچنے کی تو کوئی نہیں راہ
سگِ تخئیل پہ بند آنکھ کا دروازہ کریں

حامد جیلانی

کبھی تو سنگ لگے اور کبھی کلی کی طرح
وہ روز روپ بدلتا ہے زندگی کی طرح

کھلی جو آنکھ تو خواب وفا کا سارا نشہ
بدن میں پھیل گیا زہر آگہی کی طرح

ملا غبار کہ پلٹا ہر ایک آہٹ پر
ہوا نے بھی مجھے دھوکہ دیا اسی کی طرح

یہ حادثہ بھی سنو، مجھ کو ڈھونڈنے والا
مرے قریب سے گذرا ہے اجنبی کی طرح

میں کھولتا نہیں آنکھیں کہ نقش لمحۂ دید
بکھر نہ جائے فضاؤں میں روشنی کی طرح

تمام شہر میں جیسے رواں ہوں بت حامد
عجیب ڈالی ہے لوگوں نے خامشی کی طرح

ناصر زیدی

پھول صحرا میں کھلا دے کوئی
میں اکیلا ہوں صدا دے کوئی

کوئی سناٹا سا سناٹا ہے
کاش! طوفان اٹھا دے کوئی

جس نے چاہا تھا مجھے پہلے پہل
اس ستمگر کا پتہ دے کوئی

جس سے ٹوٹے مرا پندارِ وفا
مجھ کو ایسی بھی سزا دے کوئی

رات ہوتی ہے تو میں جاگتا ہوں
اس کو جا کر یہ بتا دے کوئی

جو مرے پاس بھی ہے دور بھی ہے
کس طرح اس کو بھلا دے کوئی

عشق کے رنگ لئے پھرتا ہوں
اس کی تصویر بنا دے کوئی

دل کے خرمن میں نہاں ہیں شعلے
اپنے دامن کی ہوا دے کوئی

پھول پھر زخم بنے ہیں ناصر
پھر خزاؤں کو دعا دے کوئی

مخمور سعیدی

دلِ خراب کی کیجے نہ دیکھ بھال بہت
کہ پڑ چکے ہیں اب اس آئینے میں بال بہت

لہو کی آگ میں جل جائیں جسم و جاں پہلے
کھلیں گے پھول سرِ وادیٔ خیال بہت

ابھی کچھ آئینے اس خاکداں میں روشن ہیں
اڑی ہے گرچہ یہاں گردِ ماہ و سال بہت

پڑے تھے دل میں جو یادوں کے گھاؤ بھر نہ سکے
گزرتے وقت نے کی سعیٔ اندمال بہت

گریز! ہم تری یادوں سے کس طرح کرتے
کہ خود سے بچ کے گزرنا تو تھا محال بہت

ہزار قافلۂ غم ادھر سے گزرے ہیں
زمیں ہے شہرِ تمنا کی پائمال بہت

بہ رنگِ موجِ ہوا ہم گذر گئے مخمور
ہماری راہ میں پھیلے تھے یوں تو جال بہت

حباب ہاشمی

وہ جا ہے جو بھی کرے پھر بھی خوش ادا ہی لگے
ہماری بات مگر اُس کو ناروا ہی لگے

نہ جانے کون سا جادو ہے اس کی آنکھوں میں
وہ اجنبی ہے مگر مجھ کو آشنا ہی لگے

کبھی وہ سامنے آئے تو کچھ بھی کہہ نہ سکوں
جو کچھ کہوں تو اسے حرفِ مدعا ہی لگے

ہماری، آپ کی نظروں میں شیخ کچھ بھی سہی
کوئی جو پارسا دیکھے تو پارسا ہی لگے

کوئی بتاؤ کہاں قافلے سے بچھڑا تھا
جہاں بھی گرد اڑے مجھ کو قافلہ ہی لگے

بھلے برے میں کوئی امتیاز کیا کیجے
کہ راہ زن بھی اگر ہو تو رہنما ہی لگے

حباب اس بتِ کافر کا پوچھنا ہی کیا ہے
جو ظلم و جور کے باوصف بھی خدا ہی لگے

شمیم حنفی

بند کرکے کھڑکیاں، یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

پینے پتھر سہہ لئے لیکن صدا قاتل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا، گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آوازِ نفس خاموش ہے
زندگی کی بات کر، یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

مدتیں گزریں اسی گھر میں تری تصویر تھی
آج خود کو دیکھ لے، میرا پرانا گھر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگارِ وقت اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

کیا پتہ زنجیر میں ڈھل جائے چادر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے اب جانبِ بستر نہ دیکھ

خاک و خوں میراث تیری، خاک و خوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

افضل احسن

سفید جسم مہکتی ہواؤں جیسا ہے
وہ چہرہ زرد ہے پھر بھی شعاعوں جیسا ہے

میں اپنے آپ سے سہما ہوا ہوں ڈرتا ہوں
ہے کون جو مرے اندر بلاؤں جیسا ہے

نہ جانے کون سا جھونکا کدھر کو لے جائے
مرا سفر تو بھٹکتی صداؤں جیسا ہے

ہے یوں تو ہر طرح انمول اپنا یار مگر
کچھ عادتاً ہی ذرا بے وفاؤں جیسا ہے

میں ہوں صدف کی طرح ایک بوند کا طالب
ترا کرم تو برستی گھٹاؤں جیسا ہے

تھا ایک میرا بھی سورج سو وہ تو ڈوب گیا
یہ جسم اب تو اندھیری گپھاؤں جیسا ہے

لڑی ہے آنکھ تو اس سے کہ افضل احسن جو
ہر ایک بات میں بالکل خداؤں جیسا ہے

عبدالصمد تپش

نذرِ غالب

غلط کہ میری نگاہوں کو پارسا کہیے
یہ رعبِ حسن سے اٹھتی نہیں ہیں کیا کہیے

اِدھر یہ حال کہ دل سرکشی پہ آمادہ
اُدھر اشارۂ ابرو کہ سب بجا کہیے

انھیں یہ شوق سنیں اور غیر بن کے سنیں
ہمیں یہ ضد کہ کسی اجنبی سے کیا کہیے

یہ کیا کہ سچ بھی کہوں میں تو کذب ہی ٹھہرے
غلط کہے جو اگر غیر مرحبا کہیے

گذارشوں کو مری شوخیاں نہ ٹھہرائیں
سزا کو آپ نہ اس طرح ناسزا کہیے

نہ حادثات و موانع کے چھیڑیے قصے
نہ کم سوادیٔ رہ رو کا ماجرا کہیے

جنوں نوازوں کی روداد خونچکاں لکھیے
حکایتِ روشِ منزل آشنا کہیے

جہان بھر سے تپش دوستی نہیں اچھی
اگر یہ راس بھی آئے تو معجزا کہیے

زہرا نگاہ

ہر آن ستم ڈھلائے ہے، کیا جانیے کیا ہو
دل غم سے بھی گھبرائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

کیا غیر کو ڈھونڈیں ترے کوچے میں ہر اک
اپنا سا نظر آئے ہے، کیا جانیے کیا ہو

آنکھوں کو نہیں راس کسی یاد کا آنسو
تھم تھم کے ڈھلک جائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

اس بحر میں ہم جیسوں پہ ہر موجۂ پرخوں
آ آ کے گزر جائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

دنیا سے نرالے ہیں تری بزم کے دستور
جو آئے سو پچھتائے ہے، کیا جانیے کیا ہو

مشتاق قمر

آئس کریم کھانا

بعض احباب کا خیال ہے کہ ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد تحصیل شہرت کی خاطر میں اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا ہوں۔ اگرچہ شہرت حاصل کرنے کا یہ طریقہ کم خرچ بالانشیں ضرور ہے اور بعض صورتوں میں تیر بہدف بھی۔ مگر میں اسے سراسر اپنے خلاف بہتان تراشی گردانتا ہوں۔ کیونکہ اول تو ابھی میرے ترکش کے سارے تیر ختم نہیں ہونے پائے دوئم آئس کریم کے خلاف انسانی تاریخ میں سب سے پہلے آواز بلند کرنے کے باوصف میں اپنے آپ کو کسی خاص اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میرا مسلک تو ہے بت شکنی اور آئس کریم کا شمار ان معروف چند بتان آذر میں ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح انسان کی مرضی کے خلاف اس کے اعصاب پر سوار ہو گئے ہیں۔

اگر آپ نے کبھی آئس کریم کھائی ہے (اور چونکہ آپ مہذب سوسائٹی کے باعزت فرد ہیں اس لیے اب تک کئی بار اس حادثے سے دوچار ہو چکے ہوں گے) تو آپ یقیناً میری ہاں میں ہاں ملائیں گے کہ اچانک اپنے سامنے آئس کریم کی "پلیٹ" خالی ہوتے دیکھ کر انسان کے تن بدن میں مسرت وانبساط کی پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں اور ہونٹوں پہ آپ ہی آپ "شکرِ ذوالجلال" کے الفاظ مچل اٹھتے ہیں۔ البتہ اس تشکر آمیز مسرت کی نوعیت اس مختصر اور ناپائیدار خوشی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو کسی چیز کے حصول کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، یہ تو اس دیرپا اور سچی خوشی کا سرچشمہ ہے جو کسی شے کو کھو دینے یا بالفاظِ دیگر اس سے رستگاری حاصل کرنے کے بعد ہماری روح کے ریگ زار میں پھوٹ نکلتا ہے۔ بے شک آغازِ کار میں آپ شکوک وشبہات کا شکار رہتے ہیں۔ آپ کو اپنی اس اچانک خوش نصیبی پر یقین

نہیں آتا۔ لیکن چمچ کے پے در پے وار خالی جاتے اور چمچ اور "پلیٹ" کے درمیان دوئی (یعنی آئس کریم) کا پردہ اُٹھ جانے کے بعد جو جلترنگ سا بجنے لگتا ہے وہ آپ کے سارے شکوک و شبہات کی نفی کر دیتا ہے۔ عام حالات میں اس پُر مسرت لمحہ کی یافت پر آپ کو اپنا ہیٹ فضا میں اُچھالتے ہوئے "ہُرے ہُرے" کا نعرۂ پُر جوش بلند کرنا چاہئے لیکن آپ اپنی دلی خواہشات کے باوجود ہر بار ایسا کرنے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ آئس کریم کی معمولی سی مقدار بھی ان غدودوں اور خلیوں کو جامد و ساکت بنا دینے کے لئے کافی ہے جو انسانی جسم میں لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس چائے، جسے "عالم خورا ک" میں آئس کریم کے حریف کی حیثیت حاصل ہے، ایسے خلیوں کو پنپنے کے وافر مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ چائے نوش کرنے کے بعد انسان کو نہ صرف اپنے اندر بلکہ گرد و پیش میں بھی زندگی کی گرم گرم اور تند و تیز جذبہ سے مملو رَو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ کا جی خواہ مخواہ دوسروں سے گپیں ہانکنے کو چاہنے لگتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گپیں مارنے کے سلسلے میں کرۂ ارض کا کوئی دوسرا مقام چائے کے میز کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جس کے قرب و جوار میں دنیا بھر کے مسائل کے حل ہر وقت دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ سو ئی صحرا میں کھو جائے یا گھنے جنگلات کی پنہائیوں میں۔ کم از کم میں نے آج تک ہر عقلمند انسان کو اسے چائے کی پیالی کے ارد گرد ہی تلاش کرتے دیکھا ہے۔ اس کے لئے ایک منطقی استدلال بھی موجود ہے۔ یعنی مسائل جس جوش و خروش اور گرما گرمی کے بطن سے جنم لیتے ہیں، ان کا حل بھی اسی جوش و خروش اور گرما گرمی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ چائے کی ایک اور خوبی جو اسے آئس کریم پر فوقیت بخشتی ہے، یہ ہے کہ جوں ہی آپ اسے جامِ سفال سے تن بدن کے خُم میں اُنڈیل دیتے ہیں، آپ حیرت انگیز طور پر رجائیت پسند بن جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری محض قصہ کہانی محسوس ہونے لگتی ہے اور آپ کو لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا احساس نہیں ہو پاتا کہ ان اونچی اونچی دیواروں کی تہہ میں موت کا لاوا اُبل رہا ہے۔ سجے سجائے چہروں پر نیستی کی پرچھائیاں مسلط ہیں۔ لیکن آئس کریم کی "پلیٹ" سامنے آتے ہی ساری گرما گرمی جاتی رہتی ہے۔ گفتگو کا ملکہ، جو انسانی سرشت میں اس طور پر ودیعت کیا گیا ہے، یکسر مفقود ہو جاتا ہے، آپ کی زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے اور اگر آپ کو بحالتِ مجبوری کوئی ایک آدھ جملہ ادا کرنا ہی پڑے تو آپ کی زبان

خلا میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کرنے والے انسان کی طرح لڑکھڑانے لگتی ہے۔ زندگی کے سیدھے سادے اور سلجھے ہوئے مسائل بھی ناقابلِ حل نظر آنے لگتے ہیں اور آپ کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا صفحۂ ہستی پر ایک بڑی سی برف کی سِل جا کر اس پر آخری کیل ٹھونک دی گئی ہو۔ اور یہ گرد و پیش میں چلتے پھرتے انسان، یہ تو محض ایسی بدروحیں ہیں جو کسی نہ کسی طور جسم کو جھٹل دے کر برف کی سِل کے نیچے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اس وقت آپ اپنے آپ کو عجیب ناگفتہ بہ حالت میں پاتے ہیں اور اگر آپ کے ساتھ یہ حادثہ کسی ایسے مقام پر پیش آیا ہو جہاں اشیائے خورد و نوش کے عوض سخت اور کھردرے چاندی کے سکّے کے ٹکڑے وصول کرنے کا رواج بھی ہو تو آپ کی حالت اور زیادہ دگرگوں ہو جائے گی اور آپ ازالہ حیثیتِ عرفی میں ہارے ہوئے مدعی کی طرح جیب کا بوجھ ہلکا کر کے، سر جھکائے، بغل میں چھتری دبائے بڑی خاموشی سے باہر نکل آئیں گے۔ گویا زندگی سے آپ کا تعلق "جتنا لو اتنا دو" کے تنگ نظر اور متعصب زدہ اصول پر قائم ہے۔

اہلِ زبان نے انسان اور آئس کریم کے اس بلا واسطہ ٹکراؤ کو، جو سال کے چند انتہائی گرم مہینوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے، مصدر "کھانا" سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات اہلِ زبان کے نزدیک درست ہو تو ہو لیکن واقعاتی اعتبار سے مصدر "کھانا" کا استعمال یہاں قطعی طور پر غیر موزوں ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ لفظ "کھانا" کے ساتھ دانتوں، زبان اور جبڑوں کے درمیان جو دھینگا مشتی کی سی کیفیت وابستہ ہے، اس کا تجربہ آئس کریم "کھانے" کے دوران میں مطلق نہیں ہو پاتا، پھر "کھانے" کا فعل بھی دو کیفیتوں سے عبارت ہے (جو ایک بہت بڑے نظام کی آئینہ دار ہیں) اول یہ کہ جوں ہی کوئی چیز ہونٹوں کی سرحد عبور کرتے ہوئے عرصۂ دہن میں داخل ہوتی ہے، ہمارا نظامِ معدہ فوراً اپنے سرحدی محافظ کو (جسے عرفِ عام میں "زبان" کہا جاتا ہے) نووارد سیاح کو خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھا دیتا ہے۔ یہ سرحدی محافظ نووارد کا معائنہ کرتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ ورنہ الٹے قدموں لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ گویا کاغذات و اسناد کی جانچ پڑتال کے مترادف ہے۔ اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے۔ اس کی حیثیت "ریڈ یشن کیمپ" کی سی ہے۔ یہ کیمپ دانتوں کی عملداری میں ہے۔ یہاں نووارد کو

ملک کے اندرونی حصوں کی قدرے عجیب و غریب آب و ہوا میں قیام پذیر ہونے کے اہل بنایا جاتا ہے۔ یعنی "پروبیشن کیمپ" میں اس کی مناسب چھان بین کے ساتھ ساتھ اکلیمیٹائز (Acclimatize) بھی کیا جاتا ہے۔ آئس کریم ایسے امن پسند سیاح کی برادری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جو ایک دن اچانک آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے، ہاتھ میں دلفریب، نازک اندام چھڑی لئے، گرد و غبار کی اوٹ سے نمودار ہو کر، آپ کو مژدۂ جانفزا سنانے آتا ہے۔ آپ کے قانون کی پوری پابندی کرتا ہے، آپ اس سے جیسا بھی چاہیں سلوک روا رکھیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے ڈپلومیٹ کی طرح سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کرتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آئس کریم تو ایک خلائی آفت ہے جسے دیکھتے ہی آپ کا سرحدی محافظ دوڑ کر کسی کنج میں جا چھپتا ہے۔ "پروبیشن کیمپ" کی خاردار تاریں خس و خاشاک سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ کاغذات و اسناد کی جانچ پڑتال نہ پروبیشن کیمپ کی چھان بین۔ ایک بجلی کا سا کوندا لپکا۔ یہ جا وہ جا اور آپ کا سارا سرحدی نظام ہی معطل ہو کر رہ گیا۔

ہر معلول کی طرح فعل "کھانے" کے بھی کچھ علل ہیں۔ ایک علت تو وہی شکم سیری کا کائناتی قضیہ ہے جس میں ہم، تم اور میر سبھی یکساں اسیر ہیں۔ دوسری وجہ محض تحصیل حظ اور چٹخارہ لینا ہو سکتی ہے۔ یہ تو طے شدہ امر ہے کہ آئس کریم شکم سیری جیسے بارِ گراں کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن بعض اہلِ وطن اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ تشنگی مٹانے کا بھی ایک لذیذ ذریعہ ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک نفسیاتی قسم کی غلط فہمی ہے جو شاید اشتہارات کی عبارت کا غلط مفہوم اخذ کرنے کی بدولت پیدا ہو گئی ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ آئس کریم (بقول اہلِ زبان) "کھانے" کے بعد جس چیز کی فوراً اور سب سے زیادہ طلب ہوتی ہے وہ ایک گلاس پانی کے سوا کچھ نہیں۔ رہی تحصیل حظ اور چٹخارہ لینے والی داستان پر فریب تو صاحب آپ لاکھ برا منائیں، میں اسے ایک لذیذ شے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انسانی جسم نے اب تک جس قدر ترقی کی ہے اس کے مطابق اشیائے خورد و نوش سے لذت کشید کرنے کا واحد ذریعہ زبان ہے (اور جیسا کہ پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں) ادھر منہ میں چمچ بھر آئس کریم کا آنا ہوا ادھر منہ یوں کھل گیا گویا کسی نے دہکتا انگارا رکھ دیا ہو۔ بے چاری زبان کی اپنی سطح گم ہو جاتی ہے

لذت و سرود کی کشید تو درکنار اس چھچھوندر کو اُگلنے، نگلنے کا سلسلہ ہی عزت و وقار کا سوال بن جاتا ہے۔

آئس کریم کا شمار نہ تو ماکولات میں کیا جا سکتا ہے نہ مشروبات میں بلکہ یہ ان دونوں کا ایسا عجیب و غریب ملغوبہ ہے جسے "کھایا" جا سکتا ہے نہ "پیا" اور نہ ہی (چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر) "اگلا" جا سکتا ہے۔ خود آئس کریم کے "برتن" کی ساخت دیکھئے۔ یوں لگتا ہے اس کا بنانے والا بڑی گومگو کی حالت میں تھا کہ اسے گلاس بنائے یا پلیٹ۔ پہلے تو اس نے اسے (شاید) سیال مادہ سمجھ کر اس کے لئے برتن کو گلاس کی طرح مدوّن کیا۔ پھر (جانے کیسے) اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے "پلیٹ" کی شکل دینا چاہی۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا کہ یہ نہ تو سیال مادہ ہے نہ اس کا تعلق ٹھوس اجسام کی برادری سے ہے۔ چنانچہ اس نے انتہائی جھلاہٹ کے عالم میں "برتن" کو اسی حالت میں رہنے دیا۔ جس کے نتیجے میں آج ہم اسے نہ "پلیٹ" کا نام دے سکتے ہیں نہ "گلاس" کا۔ اگرچہ آئس کریم کو پلیٹ اور بیرل نما ٹین کے برتنوں میں بھی کھانے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر کوشش رائیگاں ثابت ہوئی ہے ـــ آغاز میں بے شک آپ پلیٹ کو استعمال میں لا سکتے ہیں لیکن بعد میں ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب آپ اسے گلاس میں ڈال کر پینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہاں پلیٹ، چمچ دونوں آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور آپ کو بیسویں صدی کی پُررونق تہذیب سے چار ہزار سال قبل مسیح کے غاروں میں لوٹنا پڑتا ہے۔

منطقی استدلال کا تقاضا تو یہ ہے کہ آئس کریم کی پہلی چمچ منہ میں ڈالنے کے فوراً بعد آپ کا ردِ عمل یوں ہوتا ہے کہ آپ انتہائی نفرت اور برانگیختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "گلاس نما پلیٹ" کو منیجر (اور گھر میں ہوں تو بیوی) کے سر پر دے ماریں اور ایک مہذب امن پسند شہری کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی غلطی کا منہ مانگا خراج ادا کرنے کے بعد سیدھے قریبی قہوہ خانے میں جا نکلیں۔ وہاں پر نہ صرف چائے بلکہ انتقامی کارروائی کے طور پر ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ کے چپلی کبابوں کا آرڈر دے کر ایک کرسی پر خود بیٹھیں دوسری پر اپنی ٹانگیں پسار دیں۔ اور جذبات کا سارا فاضل بوجھ کچھ اس انداز سے حقے

پر ڈالیں کہ اس کی گڑگڑاہٹ سے ہوٹل کے در و دیوار میں لرزا بپا ہو جائے۔ لیکن صد افسوس کہ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو۔

اشیائے خورد و نوش میں کسی نہ کسی مقدار میں غذائیت تو موجود ہوتی ہے۔ میرے لئے یہ امر ایک معمہ سے کم نہیں کہ وہ تمام عناصر جن سے آئس کریم کا محلول تیار ہوتا ہے اپنی انفرادی حیثیت میں تو غذائیت کی قابلِ قدر مقدار کے حامل ہوتے ہیں لیکن جوں ہی یہ اپنی انفرادی حیثیت کو آئس کریم کی ایکتا میں ضم کر دیتے ہیں، غذائیت کی دولت سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ آپ شاید سائنسی استدلال سے کام لیتے ہوئے "چل لیبارٹری" کا نعرہ بلند کریں گے۔ صاحب عرض یہ ہے کہ مجھے بے جان لوہے اور فولاد کی کلوں کی نسبت انسانی ذہن پر زیادہ اعتماد ہے اور میں زندگی کے اس فلسفے کا پیروکار ہوں جس میں ہر وہ شے "غیر موجود" کا درجہ رکھتی ہے جس کی افادیت اور استعمال مشکوک ہو (اس فلسفے کا بانی بھی میں خود ہی ہوں) اگر آپ کا قیاس کہ آئس کریم میں غذائیت موجود ہوتی ہے، درست تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وطنِ عزیز میں جہاں سال بھر موسمی تغیر و تبدل کو خاطر میں لائے بغیر، پروٹین کی معمولی مقدار کے لئے ہر بیمار، لاچار (مگر حلال) جانور کو لقمۂ اجل بنا دیا جاتا ہے وہاں آئس کریم سے اتنے طویل عرصے کے لئے یہ بے اعتنائی کیوں برتی جاتی ہے؟ اور اس کے دائرۂ عمل کی موجودہ زمانی، مکانی اور طبقاتی تحدید کیوں ہے؟ ممکن ہے آپ استدلال کریں کہ یہ موسم گرما میں ظاہر ہونے والا اچھوہے۔ کیا یہی اصول چائے پر لاگو کر کے اسے صرف موسم سرما کا ثمر قرار نہیں دیا جا سکتا! لیکن آپ شاید انسان کی فطرت سے آگاہ نہیں۔ انسان گلشنِ کائنات کا بے حد ضدی، ہٹ دھرم اور چالاک رکن ہے۔ وہ ہر وقت اپنے جائز ناجائز افعال کو درست ثابت کرنے کے لئے ٹھوس دلائل اور براہین قاطع سے مسلح رہتا ہے۔ سیاست گری تو خیر بحر ذخار ہے، خورد و نوش کی محدود فضا میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ اگر انسان کو زہر کھانے کا بھی سودا سمایا تو اس نے اعلیٰ انسانی اصولوں کی آڑ لے کر زہر کا پیالہ پی لیا۔ یہاں تک کہ پہاڑیوں سے دھوپ ڈھلنے کا بھی انتظار نہ کر سکا اور جب اس زہر کے کڑوے کسیلے ذائقے سے اس کا جی متلانے لگا تو اس نے جھٹ سے

نعرہ بلند کر دیا کہ وہ دوسری بار۔ چپت کھانے کے لئے تیار نہیں اور چپکے سے رات کی تاریکی میں خوابوں کے جزیرہ کی طرف نکل گیا۔ اس پسندیدگی اور دلبستگی کا باعث ہے کہ سردیوں میں جسم گرم رکھنے کا بہانہ بنا کر اور گرمیوں میں دل و جگر کو ٹھنڈک پہنچانے کے جھنڈے تلے چائے کے خم کے خم لنڈھائے جاتے ہیں۔

آئس کریم کے ساتھ بھی اگر چائے ہی کی طرح انسان کی دلبستگی اور پسندیدگی قدرتی ہوتی تو اسے اس کے سارا سال استعمال کے لئے کوئی معقول وجہ جواز تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آتی مگر سچی بات شاید یہ ہے کہ آئس کریم کا ہماری جبلت، ہمارے احساسات و جذبات سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ اسی لئے خورد و نوش کا ہر دیانتدار ناقد اسے اُورد کے خانے میں رکھنے پر مجبور ہے۔

مگر آئس کریم سے یہ اعصابی خوف کیوں؟ اب تو یہ بُتِ طناز منہ کے بل گرنے ہی والا ہے۔ اکتوبر میں نہیں تو نومبر میں سہی۔

تفصیل متعلق ماہنامہ شاہکار، الہ آباد۔ فارم ۴۔ رول ۸

(۱) مقام اشاعت ۔ ۱۳۴ بخشی بازار الہ آباد ۳ (۲) وقفہ اشاعت ۔ ماہنامہ

(۳) طابع ۔ محمود احمد ہنر ۔ قومیت ۔ ہندوستانی ۔ پتہ ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

(۴) ناشر ۔ محمود احمد ہنر ۔ قومیت ۔ ہندوستانی ۔ پتہ ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

(۵) مدیر ۔ محمود احمد ہنر ۔ قومیت ۔ ہندوستانی ۔ پتہ ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

(۶) ملکیت ۔ محمود احمد ہنر ۔ قومیت ۔ ہندوستانی ۔ پتہ ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

میں محمود احمد ہنر اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

دستخط محمود احمد ہنر

خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خاص مضمون

خاندانی منصوبہ بندی — عوام کا پروگرام ہے

صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا اظہار خیال

راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین نے حال ہی میں قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ایک عوامی پروگرام ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا یہ پروگرام ایک عوامی پروگرام ہے۔ تمام دنیا کی آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں کہ ہم اپنے جمہوری اصولوں اور اقدار کو قربان کئے بغیر کس طرح اس پروگرام کو کامیاب بناتے ہیں۔ ہماری کامیابی دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے لئے جنھیں اپنے صحتی پروگراموں کی کامیابی کے ساتھ آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا خطرہ لاحق ہے یا آئندہ ہوگا، رہنمائی کا کام دے گی۔ راشٹرپتی نے کہا کہ اس امر کے پیشِ نظر اس ضمن میں ہماری ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

راشٹرپتی نے کہا کہ میں ذاتی طور پر اور بھارت کے راشٹرپتی کی حیثیت سے بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں، جو ہم سب کے لئے انفرادی طور پر اور بحیثیت ایک قوم کے تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ گذشتہ ۲۱ برسوں کے دوران میں ہم نے متعدد سماجی و اقتصادی شعبوں میں خاصی ترقی کی ہے۔ ہم نے زرعی پیداوار میں بھرپور اضافہ کر لیا ہے اور اس شعبے میں ایک تعمیری انقلاب رونما ہوا ہے۔ صنعتی پیداوار بھی کافی بڑھ گئی ہے اور تعلیمی سہولتوں میں

کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ہماری بنیادی صحتی خدمات کی توسیع و ترقی کی بدولت وبائی امراض
مثلاً ہیضہ، چیچک اور ملیریا کی موثر روک کی گئی ہے اور شرح اموات میں بڑی حد تک کمی آ گئی
ہے۔ بہتر طبی امداد اور دوا یا علاج کے معقول بندوبست کے سبب اب کسی بچے کی پیدائش پر
اوسطاً ۵۰ برس کی عمر تک جینے کی اُمید کی جا سکتی ہے جب کہ ۱۹۴۷ء میں صرف ۲۷ برس کی عمر
تک جینے کی توقعات تھیں، لیکن اس عرصے کے دوران میں شرح پیدائش میں نہایت خفیف سی
کمی آئی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا دشوار کن مسئلہ درپیش ہے۔
۱۹۴۷ء میں بھارت کی آبادی ۳۴۴۰ لاکھ تھی لیکن آج یہ بڑھ کر ۵۲۰۰ لاکھ سے زیادہ
ہو گئی ہے۔ آبادی کے اس بے تحاشا اضافے نے مختلف شعبوں میں حاصل شدہ ترقیوں اور بہتر
معیار زندگی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم شرح اموات کو
کم کرنے کی کوششوں کے ساتھ شرح پیدائش کو بھی بڑی حد تک کم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔
اگر ایسا نہ کر سکے تو آئندہ تین دہوں کے دوران میں ہماری آبادی دگنی ہو کر ۱۰ ہزار لاکھ
سے بھی زیادہ ہو جائے گی اور ہماری ترقیاتی کوششیں بے اثر ثابت ہوں گی۔

لیکن ہمیں اس معاملہ میں ہراساں اور نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے
یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں خاندانی منصوبہ بندی
کے طریقوں کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے جو کوششیں انجام دی گئیں ان کی بدولت
ملک کے عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور وہ اضافہ آبادی کے پریشان کن
مسئلے کے حل کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں جو جائزے لئے گئے ہیں اُن سے پتہ چلا ہے کہ اب ہمارے
عوام خاندانی منصوبہ بندی کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ہیں اور صرف دو یا تین

بچوں پر مشتمل مختصر کنبہ رکھنے کے اصول اور اس پر عمل درآمد کے روز بروز قائل ہوتے جارہے ہیں۔

آج بھارت کے اولاد پیدا کرنے کے قابل میاں بیویوں کی کل تعداد میں سے گیارہ فی صد سے بھی زیادہ یعنی ۹۰ لاکھ میاں بیوی اپنے کنبہ کو مختصر اور خوشحال بنانے کی غرض سے خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اپنا رہے ہیں۔ یہ ایک عظیم کارنامہ ہے اور متعلقہ شعبے میں ہزاروں کارکنوں نے جس تن دہی، جوش و خروش اور خلوص دل سے کام کیا ہے، مجھے اس پر فخر ہے اور یہ سماجی انقلاب انہیں کوششوں کی بدولت رونما ہوا ہے۔

تین برس قبل جب ہم نے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو نہایت وسیع پیمانے پر شروع کیا تھا تو ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس کی کامیابی کے بارے میں شبہہ تھا لیکن آج میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ شک و شبہات کے بادل چھٹتے جارہے ہیں اور اس شعبہ میں ایک تعمیری انقلاب کے امکانات روشن ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس پروگرام نے عوام میں جو مقبولیت حاصل کرلی ہے، اس سے عوام کی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوگا۔

اس موقع پر میں عوام کی توجہ ایک ضروری امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ گذشتہ تین برسوں کے دوران میں اس پروگرام میں کافی مقبولیت ہوئی ہے، لیکن ابھی اس کام میں ہمیں بہت آگے جانا ہے اور اس ادھوری کامیابی سے مطمئن ہو کر ہمیں بے فکر ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے اس لئے ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو مکمل طور پر کامیاب بنانے کے کام میں اپنا بھرپور تعاون دیں اور ملک کے ہر میاں بیوی کو چاہیئے کہ اپنے تئیں وہ یہ فیصلہ کرلیں کہ اُن کا کنبہ ہر حال میں صرف دو یا تین بچوں پر مشتمل ہوگا اور جن میاں بیوی کے تین سے زیادہ

بچے ہیں انھیں چاہئے کہ اب اور کوئی بچہ نہ چاہیں۔

ماں کی بہتر صحت اور بچوں کی مناسب دیکھ بھال کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دو یا تین بچوں کی پیدائش میں مناسب وقفہ ہو۔ ہمیں یہ پیغام اولاد پیدا کرنے کے قابل ہر میاں بیوی تک پہنچانا ہے اور انھیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کرنے اور چھوٹا کنبہ رکھنے کے اصول پر چلنے کی ترغیب دینی ہے۔ تب ہی ہم اپنی ترقیاتی کوششوں کو کامیاب ہوتے دیکھ سکیں گے۔

یہ ایک انتہائی اہم کام ہے اور اس کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صرف سرکاری امداد اور کوشش کافی نہیں ہوگی بلکہ اس پروگرام کی کامیابی ملک کے لاکھوں میاں بیوی کے فیصلوں اور بامقصد کوششوں پر منحصر ہے۔ اس لئے یہ ایک عوامی پروگرام ہے اور عوام کا بھرپور تعاون ہی اس کی کامیابی کا ضامن ہے۔

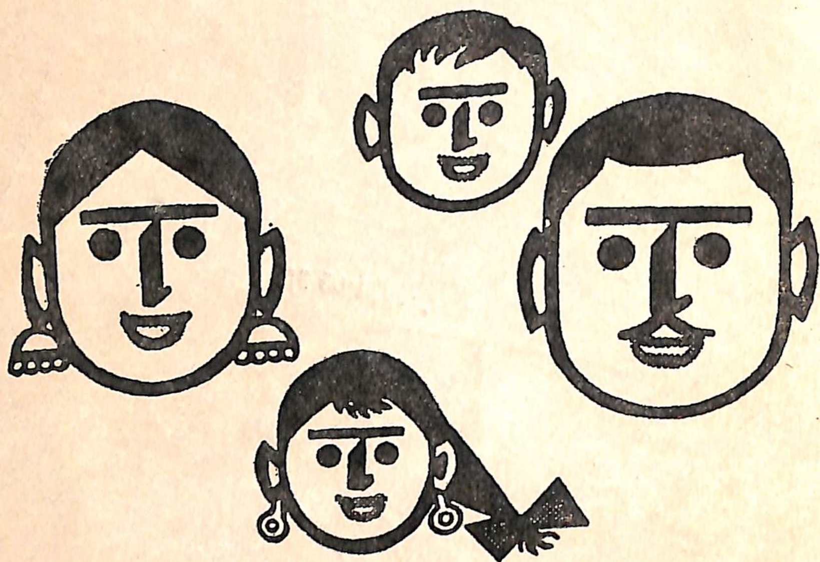
اس کام میں ان لوگوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جو دوسرے کے خیالات کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے عوامی رہنماؤں کو چاہئے کہ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں اپنا عملی تعاون پیش کریں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب سماجی حیثیت اور سیاسی عقائد کی تفریق کے بغیر سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی حمایت کی ہے اور اس کی افادیت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقتاً ایک فلاحی پروگرام ہے اور اس سے ہر خاندان کی بہبود ممکن ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے پندرھواڑے کا آغاز کرتے ہوئے میں اپنے تمام ہم وطنوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے ہر امکانی کوشش کریں اور صرف اسی صورت میں ہم بھارت کے لئے ایک خوشحال اور صحت مند مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔

محمود احمد ہنر ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہکار ۱۲۴ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا

بس دو یا تین بچّے
ہوتے ہیں گھر میں اچھّے



فیملی پلاننگ سینٹر کی پہچان : لال تکون

No. 59 May 1969

SHAHKAR

Regd. No. L 959 ALLAHABAD.

